REGD. L. NO.7243

Phone 880800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

اپریل 1981

اس پرچہ میں :-

اسلامی حکومت ۔ نہ جمہوری نہ شخصی
(جامع مقالہ)

کیا یہ قوانین اسلامی ہیں؟
(لمعات)

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک --/۴ پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۴	اپریل ۱۹۸۱ء	شمارہ ۴

فہرست

۱- اطلاعات ---- (قانون ساز حضرات کی خدمت میں) ---- ۲
۲- قرآنی درس کے اعلانات ---- ۱۶
۳- شرک ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۱۷
۴- فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ---- ۲۴
۵- وحدتِ ملت ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۲۵
۶- سجدۂ شکرانہ (رجم کو اسلامی تعلیمات کے منافی تسلیم کر لیا گیا) ---- ۳۸
۷- حقائق و عبر ---- (۱) یتیم پوتے کی وراثت ---- ۳۹
(۱۱) زکوٰۃ کا ڈیکلریشن
۸- اسلامی نظامِ حکومت : نہ مغربی جمہوریت - نہ شخصی حکومت ! ---- ۴۱
(محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مقالہ)

ایڈیٹر: محمد خلیل - ناشر: سراج الحق - مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس، ۹ ایبک روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(قانون ساز حضرات کی خدمت میں)

مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردشِ دو لابی ہے جو شروع سے آج تک جاری و ساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد، ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبان پر آتی ہے۔ ان کے مظالم کا رونا خود ان کی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ ان کے مرتب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدتِ العمر ختم کرنے کے بعد صفحۂ تاریخ سے مٹ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام سے کھینچ دیتی ہے ان کی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط نہ تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مذہب کا تعلق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس سلسلۂ حدوث و ثبات کے لئے ایک نئی طرح ڈالی۔ اس نے کچھ اقدار متعین کیں اور کچھ اصول عطا فرمائے جن کے متعلق کہہ دیا کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ یہ کبھی تبدیل نہیں ہو سکیں گے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ حکومتیں آئیں اور جائیں۔ ان کے آئین و دساتیر بدلتے رہیں۔ لیکن ان ابدی اصول و اقدار کو کوئی حکومت بدل نہیں سکے گی۔ ان کا نام اسلام ہے اور ان کے مطابق قائم کردہ نظام کا نام الدین۔ الدین کے یہ اصول و اقدار غیر متبدل رہیں گے، ان کے نفاذ کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ جس حکومت کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا، وہ اسلامی حکومت کہلائے گی۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوگی، تو قرآنی اقدار و اصول، قرآن کے صفحات میں محفوظ رہیں گے۔ اور ان کے نفاذ کے لئے جو طرق و اسالیب (سابقہ) اسلامی حکومت نے وضع اور نافذ کئے تھے ان کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت، مذہبی رسوم و مناسک کی رہ جائے گی۔ یہ وہ قدر مشترک ہوگی جس کے ساتھ تمسک، یا جس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے سے۔ اتنا ہی ہوگا کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والی قوم کا تشخص باقی رہے گا۔ ان رسوم و مناسک کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لینا انہیں کتاب اللہ

کے ہم پلہ قرار دینا ہوگا جو شرک ہے۔

اسلامی حکومت، حضور نبی اکرم صلعم کے عہد ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک باقی رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام و اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لیئے جو طور طریق اختیار کئے گئے تھے (جنہیں آپ جزئی قوانین شریعت کہہ لیجئے) انہیں نہ غیر متبدل قرار دیا گیا تھا نہ انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ وجہ تھی کہ اس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتب و مدوّن کیا گیا، نہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا اس لیئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ــــ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث رسول اللہ یا عہدِ خلافت راشدہ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا، تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابنِ حزمؒ کے قول کے مطابق) عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآن مجید کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اس دور کے بدلتے نہ بدلنے والے احکام کی ایک چِٹ بھی کہیں نہیں ملتی۔

اس کے بعد بنوامیہ کا دور آیا۔ اس دورِ حکومت کا جو نہایت بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے، ہم سردست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم اس کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکامِ حکومت کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں کیا۔ اور جب مرتب ہی نہیں کیا تو اس کی حفاظت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ آپ اس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے، نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔ انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے پہنچایا۔ یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ اُمّت میں فرقے پیدا ہوئے، نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد عباسی دور ہمارے سامنے آتا ہے جو سابقہ ادوار سے بالکل مختلف ہوا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی، کیونکہ ملوکیت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں جو یکجا ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتب ہوئیں۔ ان کی وجہ سے اُمّت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا۔ جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو اُمّت میں توحید بھی باقی نہ رہی ــــ توحید تو ایک طرف، اُمّت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔ وہ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی۔ یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔ جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا، اُمّت کا انتشار، خلفشار، افتراق، اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب اُمّت کا کوئی فرد، صرف مسلم کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے بتانا پڑتا تھا کہ کونسا مسلمان ــــــ شیعہ۔ سنی۔ اہلِ حدیث۔ اہلِ فقہ۔ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں)۔

عباسی دورِ حکومت ختم ہوگیا لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اور ان کی نسبت سے مختلف

فرقے آگے چلتے گئے۔ اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہے اور ان کے پیروؤں کا نام مسلمان۔ اور نظامِ حکومت، ملوکیت۔ یعنی مسلمانوں کی زندگی، اصول اور فروع، دونوں اعتبار سے خلافِ اسلام! یہ فقہی احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے۔ اس کی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولر نظام رائج کر لیا۔ یعنی قرآن کی طرف وہ پھر بھی نہیں آئیں۔ قرآن کی طرف وہ آ بھی نہیں سکتی تھیں۔ قرآن تو ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

مدّتہا سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی یہی صورت ہے ——— یعنی نظامِ حکومت یا ملوکیت یا سیکولرزم ہے۔ اور اس میں شخصی قوانین کی حد تک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کارفرما۔ قرآن کا مصرف، صرف یہ رہ گیا ہے

کہ از یٰسین او، آساں بمیری۔

——— (۰) ———

اس صورتِ احوال کی شدتِ احساس کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی جدید مملکت کا تصوّر دیا جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اسلام اپنی حقیقی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے آ سکے۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ دونوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس مملکت میں قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب یہاں قانون سازی کا وقت آیا تو نہ علامہ اقبالؒ موجود تھے نہ قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ۔

عام پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہاں تیس سال میں کسی حکومت نے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کبھی پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے حالات سازگار ہوئے تو ہم بتائیں گے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کیوں نہ ہوئے اور یہ کتنی بڑی سازش تھی جس کے نتیجہ میں یہ مملکت قرآنی نہ بن سکی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ جس مملکت میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں وہاں کونسے اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں؟ اس سوال کا جواب مہیا کرنے کے لئے، ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندہ (۳۱) علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں متفقہ طور پر یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ ملک کے لئے ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اس ریزولیوشن کے بعد دھوم مچا دی گئی کہ علماء حضرات نے اتمامِ حجت کر دیا ہے۔ اب اگر اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جاتے تو اس سے اربابِ حکومت کی بدنیتی واضح ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ ریزولیوشن درحقیقت بہت بڑا سراب ہے۔ یہ حضرات جانتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے (حتیٰ کہ یہی علماء جنہوں نے اس ریزولیوشن پر دستخط کئے ہیں) متفقہ طور پر اسلام تسلیم کر لیں۔ یہ حضرات جانتے تھے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن وہ اس کا اعتراف کس طرح کر لیتے! ان کی طرف سے اس کا جواب تو کوئی نہ دیا گیا، عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ مشہور کر دیا جائے کہ یہ لوگ منکرِ حدیث ہیں۔ اور اس طرح قوم کی توجہ دوسری طرف منتقل کر دی جائے۔

اس دوران میں ایک دفعہ (مرحوم) صدر ایوب نے یہ پیش کش بھی کر دی کہ اگر علماء حضرات ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر دیں تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے دستخط کر دیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ شخص علماء کے اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے!

وقت گزرتا گیا اور ان حضرات کی طرف سے ہر حکومت کے خلاف یہ پراپیگنڈہ جاری رہا کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے، اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کے خلاف انکارِ حدیث کا خود ساختہ الزام بھی۔ تا آنکہ ۱۹۷۰ء میں (مرحوم) مودودی صاحب کو اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے واقعی کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ علماء حضرات میں سے کسی نے نہ ان کے اس اعلان کی تردید کی، نہ انہیں منکرِ حدیث قرار دیا۔

مرحوم سے پوچھا گیا کہ پھر مملکت میں اسلامی قوانین کس طرح نافذ ہونگے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے (حالانکہ وہ خود فقہ حنفی کے سخت خلاف تھے) گویا کتاب و سنت کی رو سے مرتب کردہ ضابطہ قوانین کو تو تمام فرقے اسلامی تسلیم نہیں کریں گے۔ فقہ حنفی کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کر لیں گے!

کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب آپ جانتے تھے کہ کتاب و سنت کے مطابق ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو آپ نے (۱) ۱۹۵۱ء والے ریزولیوشن پر دستخط کیوں ثبت فرمائے تھے۔ (۲) بیس سال تک ہر حکومت کے خلاف یہ پراپیگنڈہ کیوں کرتے رہے کہ فقہ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ اور (۳) اب جو آپ مشورہ دے رہے ہیں کہ ملک میں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کر دی جائے تو کیا یہ تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہوگی؟ کسی نے ان سے آسانہ پوچھا! اصل یہ ہے کہ ہماری قوم اسلام کی طرف سے کچھ ایسی دل برداشتہ ہو کر دور ہو چکی ہے کہ وہ مذہب سے متعلق امور کو (SERIOUSLY) لیتی ہی نہیں، حالانکہ یہ وہ گوشہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے سانس لینے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سابقہ حکومتیں جانتی تھیں کہ جس ملک میں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہوں وہاں کسی ایک فقہ کو قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا، اس لئے انہوں نے اس مشورہ یا تجویز کو قابلِ پذیرائی نہ سمجھا۔ موجودہ حکومت نے البتہ اس پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ جو آپ ملک میں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت وغیرہ کے چرچے سن رہے ہیں۔ اس سے درحقیقت مراد فقہ حنفی کا اجرا ہے۔ اور اس کے نتائج ابھی سے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے چند قوانین "حدود" (سزاؤں) سے متعلق نافذ کئے گئے جو ناقابلِ عمل ثابت ہوئے۔ زکوٰۃ کے متعلق احکام نافذ کئے گئے تو ان کے خلاف اس شدت سے احتجاج ہوا کہ حکومت کو اس کی اجازت دینی پڑی کہ ہر شخص اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کر سکے، یعنی یہ بھی مملکت کا قانون نہ بن سکا۔ اب "قصاص" وغیرہ سے متعلق مجوزہ قوانین کا ضابطہ ملک میں گشت کر رہا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے خلاف ہزاروں کی تعداد میں تجاویز موصول ہو چکی ہیں۔

ہمارا تعلق کسی فرقہ سے نہیں اس لئے ہمارے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم فلاں فقہ کے حق میں ہیں اور فلاں کے خلاف۔ نہ ہی ہم ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں جو یہ سمجھا جائے کہ ہم سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکومت کے خلاف تنقید کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور قرآن کریم کو دین میں سند اور حجت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن کی رُو سے ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جہاں کوئی ایسی بات اسلام کی طرف منسوب کی جا رہی ہو جو قرآن کے خلاف ہو، ہم اس کی نشاندہی کریں اور مخالفت بھی۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہم اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے ہیں بارگاہِ خداوندی میں اسی جوابدہی کا احساس ہے جس کی رُو سے ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہاں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے اس کا جائزہ لے کر یہ بتائیں کہ اس میں فلاں بات قرآن کے خلاف ہے۔ اگر حکومت اپنے قوانین کو محض قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرے تو ہمارے جائزہ کا انداز اور ہوگا لیکن اگر انہیں اسلامی قوانین کہہ کر نافذ کیا جائے تو پھر ہم پر لازم آجاتا ہے کہ قرآنی روشنی میں

ان کا جائزہ لیا جائے۔ یہی ان سطور کی تسوید سے مقصود ہے اور اس میں ہمارا اوّلین روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے جو ان قوانین کو مدوّن کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں حکومت بھی برابر کی ذمہ دار ہوتی ہے بلکہ قوانین مرتب کرنے والوں سے بھی زیادہ ذمہ دار، لیکن چونکہ قانون سازی کا آغاز، ان کے مرتب کرنے والوں کی طرف سے ہوتا ہے اور وہی انہیں "اسلامی قوانین" کہہ کر حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس لئے ہم سب سے پہلے انہی حضرات کو درخورِ توجہ سمجھتے ہیں۔ امید ہے وہ ہماری ان گذارشات پر بہ تقاضائے ایمان، غور فرمائیں گے۔

(۰)

اس سلسلہ میں قدمِ اوّل یہ ہے کہ اسلامی قانون اسے کہیں گے جو اسلامی حکومت کی طرف سے نافذ ہو۔ اگر کوئی قانون، قرآن، سنت، فقہ کے مطابق بھی ہو لیکن وہ نافذ ہو کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے، تو اسے اسلامی قانون نہیں کہا جائے گا۔ (مثلاً) اگر بھارت میں شراب کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے، تو اس حکومت کے قانون کو اسلامی نہیں کہا جائے گا، حالانکہ اس کے مطابقِ اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے نفاذ کے لئے، جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے قیام کو لاینفک قرار دیا۔ اسلامی مملکت کے قیام سے: درحقیقت ایک ایسا نظام قائم یا ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جو منشاء خداوندی کو پورا کرتی ہے۔ احکامِ خداوندی اسی نظام یا فضا میں نافذ ہونے سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ اور وہ مقصد ہوتا ہے افرادِ معاشرہ کے قلب و نگاہ میں صحیح تغیر۔ ان قوانین یا احکام کو غیر اسلامی فضا میں میکانکی طور پر نافذ کرنے سے یہ مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے کیوں کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ...... (۲/۱۷۷) "نیکی یا کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف....." اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی کی میکانکی طور پر ادائیگی سے ان کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ مقصد پورا ہوتا ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی سے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے (آیت کے اگلے حصّے میں یہی کہا گیا ہے)۔ اور یہ تبدیلی ہوتی ہے اُمّت کے اجتماعی نظام کے اندر رہتے ہوئے جو قرآن کے ساتھ وابستگی اور پیوستگی سے وجود میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ (۳/۱۰۳) کتابِ خداوندی کے ساتھ وابستگی کے ساتھ جَمِيعًا کی شرط کے معنی یہ ہیں کہ ان احکام کا مقصد، جماعتِ مومنین کے اجتماعی نظام ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے دین نہ انفرادی ہے اور نہ ہی غیر اسلامی نظام یا حکومت میں اس پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔

لہٰذا، (۱) احکامِ خداوندی اس وقت اسلامی کہلا سکتے ہیں، جب وہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں۔

(۲) یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک مملکت کے اسلامی ہونے کی شرط کیا ہے؟ یعنی اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں فرق کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے کھلے کھلے الفاظ میں کر دی ——— پہلے کہا:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵/۴۷)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

پھر فرمایا:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵/۴۵)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

اور آخر میں دوٹوک الفاظ میں اس فیصلہ کن حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

بات واضح ہے کہ

(۱) جو حکومت ما انزل اللہ (جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے) کے مطابق نہیں، اس میں کسی کام کو بھی نیک عمل" نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ بظاہر نیک کام ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ وہ حکومت فاسقین کی ہے۔

(۲) ایسی حکومت میں کوئی فیصلہ مبنی بر عدل نہیں کہلا سکتا، کیونکہ وہ ظلم پر مبنی ہے۔

(۳) ایسی حکومت، اسلامی کہلا ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ نظام کافرانہ ہے۔ کفر و اسلام میں یہی، حدِ فاصل ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ " ما انزل اللہ " سے مراد کتاب اللہ (خدا کی کتاب۔ یعنی قرآن مجید) ہے۔ فرمایا:۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ..... فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ..... (۵/۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے ... سو تم لوگوں کے فیصلے اسی ما انزل اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے سوا کسی چیز کو " ما انزل اللہ " کہہ کر نہیں پکارا۔ اسی " ما انزل اللہ " پر نبی اکرمؐ خود ایمان لائے تھے، اور دیگر مومنین بھی۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط (۲/۲۸۵)

رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب نے اس کی طرف نازل کیا۔ اور مومن بھی (اسی پر ایمان لانے سے مومن کہلاتے ہیں)۔

اسی کے اتباع کا حکم جماعتِ مومنین (مسلمانوں) کو دیا گیا۔ اور اس کے سوا دوسروں کے اتباع سے منع کیا گیا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے سوا کسی اور بزرگ کا اتباع نہ کرو۔

اسی کتاب کو رسول اللہؐ، اُمت کو دے کر گئے تھے اور اسی کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ اگر تم اس کے ساتھ متمسک رہے تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ حضورؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ

قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہ۔ کتاب اللہ۔

(بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے کتاب اللہ۔

خدا نے بھی اُمّتِ مسلمہ کو اسی کتاب کا وارث، بنایا تھا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ ... (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ کوئی مملکت اس وقت اسلامی کہلا سکتی ہے جب اس کا تمام کاروبار قرآن مجید کے مطابق سرانجام پاتا ہو۔ وہ چند احکام کے نفاذ سے (خواہ وہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں) اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ اس معاشرہ کو پورے کا پورا اسلامی ہونا چاہیئے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ... (۲/۲۰۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس امن و سلامتی کے نظام معاشرہ میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

یہ روش کہ بعض احکام اسلام کے لئے لئے، بعض غیر اسلامی رہنے دیئے، بدترین نظام ہے۔ فرمایا:۔

... اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ... (۲/۸۵)

کیا تم الکتاب کے بعض حصّے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق۔

اس میں شبہ نہیں کہ کسی غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی میں تبدیل کرنے کے لئے وقت درکار ہوگا اور یہ پروگرام تدریج اپنی تکمیل تک پہنچے گا۔ لیکن اس تدریج و امہال میں، ترجیحات کے اصول کا مدِّنظر رکھنا ضروری ہوگا۔ ان ترجیحات میں، سب سے پہلے (احکام و قوانین کے بجائے) اقدار کی تعلیم، تدریج اور تنفیذ کا مرحلہ سامنے آئے گا۔ اس سے سب سے پہلے ذہنیتیں بدلیں گی۔ پھر قلب و نگاہ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی واقعہ ہوگی کہ احکام و قوانین کی پابندی ان افراد کا قلبی تقاضا ہو جائے گا۔ جب اس طرح معاشرہ کی فضا اسلامی ہو جائے گی تو پھر قوانین کے نفاذ کی باری آئے گی اور اس میں بھی تعزیرات کا مقام سب سے آخر میں ہوگا۔ خود قرآنِ کریم کی تنزیل بھی اسی اصول کے مطابق ہوئی تھی۔ حضورؐ کی نبوّت کا ابتدائی تیرہ سال کا عرصہ مکّہ میں گذرا۔ اس دوران میں وہ سورتیں نازل ہوئیں جن کا مقصد قلب و نگاہ میں تغیّر پیدا کرنا تھا۔ یعنی دل و دماغ کو "مسلمان کرنا"۔ حضورؐ کی عمر نبوّت کا پچاس فیصد سے زیادہ عرصہ اسی مقصدِ عظیم میں گذر گیا۔ اس کے بعد کہیں جا کر (مدنی زندگی میں) احکام و قوانین کی باری آئی۔ یعنی یہ احکام، اسلامی معاشرہ میں نافذ ہوئے۔ اگر انہیں مکّی دور میں نافذ کر دیا جاتا تو وہ کبھی نتیجہ پیدا نہ کر سکتے جو مدنی دور میں برق رفتاری سے پیدا ہوتا چلا گیا۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ

پہلے مفصّل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنّت و دوزخ کا ذکر ہے۔ (یعنی ترغیب و ترہیب کے

متعلق سورتیں)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب کی ممانعت کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتداء ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے انکار کر دیتے۔ (بخاری۔ باب تالیف القرآن)

اس قسم کے فیصلے کرتے وقت لوگوں کی افتادِ طبیعت اور جذباتی میلانات کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیرِ نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے، اسے ابراہیمی خطوط کے مطابق از سرِ نو تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا:۔

اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اساسِ ابراہیمی پر اس کی تعمیر کرتا اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔ (مسلم۔ باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اسلامی احکام کے نفاذ میں اصولِ تدریج اور ترجیح کا خیال رکھنا کس قدر ضروری ہے۔

ہم نے پاکستان میں (محاورہ کی رُو سے) گھوڑے کے آگے گاڑی جوت دی۔ یعنی جو کام سب سے آخر میں جا کر کرنے کا تھا، ہم نے ابتداء ہی وہاں سے کر دی۔ یعنی ہم نے ایک غیر مسلم معاشرہ اور مملکت میں اسلامی احکام نافذ کرنے شروع کر دیئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان احکام کی افادیت کو ہمارے ذہنوں نے قبول کیا اور نہ ہی ان کی اطاعت کے لئے ہمارے قلوب جھکے۔ بجائے اس کے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے، ہم بھلا اٹھے اور اسے سرکشی اور الحاد و بے دینی پر محمول کرنے لگ گئے۔ اس سے معاشرہ پہلے بھی زیادہ غیر اسلامی ہو گیا۔ یعنی پہلے اگر اسلامی احکام کی پابندی نہیں ہوتی تھی تو کم از کم دل میں ان کا احترام ضرور تھا۔ اب ان کے خلاف دلوں میں کبیدگی پیدا ہو گئی اور نئی نسل کے ذہنوں میں سرکشی۔

(۰)

اب ہم ان حضرات سے براہِ راست مخاطب ہونا چاہتے ہیں جو پاکستان میں قوانینِ شریعت مدوّن کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ حضرات سب سے پہلے اس حقیقت کا احساس کیجئے کہ اسلامی قوانین مرتب کرنا کتنی عظیم ذمہ داری کا فریضہ ہے۔ سیکولر قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں جو ابدہی پارلیمان یا زیادہ سے زیادہ سربراہِ مملکت تک محدود ہوتی ہے، اور اس میں سہو و خطا کا اثر بھی نہ کچھ ایسا دُور رس ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کا ازالہ چنداں دشوار۔ لیکن اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں جواب دہی بارگاہِ خداوندی میں ہوتی ہے جس کا سلسلہ اور از اس دنیا سے شروع ہو کر اُخروی زندگی تک پہنچتا ہے۔ ذمہ داری کے اس احساس نے کبھی آپ کے قلب میں لرزش اور روح میں ارتعاش پیدا کیا ہے؟ کیا اس کا خیال کرتے ہوئے آپ کی روح میں کپکپی پیدا ہوتی ہے، یا آپ اس فریضہ کو محض ایک دفاتری (ROUTINE) سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ معاف فرمایئے۔ نظر تو کچھ ایسا ہی آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کبھی اس قسم کے قوانین مرتب نہ کرتے جن پر علم روتا اور عقل ماتم کرتی۔ اور قرآن فریاد کناں ہوتا!

پھر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ان قوانین کے اثرات کس قدر دُور رس ہیں۔ لوگ ان احکام و قوانین کی اطاعت

اسلامی قوانین یا احکامِ خداوندی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سے وہ جس گمراہی کا شکار ہوتے ہیں، آپ نے کبھی خیال کیا ہے کہ اس سے آپ کے سر پر کس قدر بوجھ لد جاتا ہے؟ سوچئے کہ کہیں آپ کا شمار اس زمرے میں تو نہیں ہو جاتا جس کے متعلق فرمایا کہ

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ۝ (۱۶/۲۵)

وہ اپنی غلط کاریوں کا پورا پورا بوجھ بھی اٹھائے ہوں گے، اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی جنہیں انھوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہوگا۔ سوچو کہ یہ بوجھ کس قدر کمر شکن ہوگا!

(۳) آپ نے گزشتہ صفحات میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے:۔

(ا) صرف کتاب اللہ کے مطابق حکومت کو اسلام قرار دیا ہے اور اس کے خلاف ہر حکم، ہر قانون، ہر فیصلہ کو فسق، ظلم اور کفر سے تعبیر کیا ہے! اس نے صرف اسی کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا ہے۔ اس کے سوا اوروں کی اطاعت کو غیر اللہ کی اطاعت کہا ہے۔

(ب) رسول اللہؐ نے اسی کتاب کی اطاعت خود کی اور اسی کی اطاعت کے لئے مملکت قائم فرمائی۔

(ج) اسی کی اطاعت و اتباع کا حکم اُمتِ مسلمہ کو دیا گیا۔

(د) رسول اللہ نے اسی کتاب کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ اس کے ساتھ کسی اور چیز کو واجب الاطاعت اقرار نہیں دیا۔

(ر) اُمتِ مسلمہ کو اسی کتاب کا وارث قرار دیا گیا۔

(ص) قیامت میں (ہمیں دیکھ کر) رسول اللہ کی فریاد یہ ہوگی کہ

وَقَالَ الرَّسُولُ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۝ (۲۵/۳۰)

اور رسول کی فریاد ہوگی کہ اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

حضورؐ کی فریاد، ترکِ قرآن کے خلاف ہوگی کسی اور چیز کے ترک کر دینے کا اس میں ذکر نہیں کیونکہ ترکِ اسلام کے معنی ہی ترکِ قرآن ہیں۔

(۴) ـــــ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے قوانین مرتب کرنا جو قرآنِ کریم کے خلاف ہوں اور انہیں اسلامی قوانین کہہ کر رائج کرنا، کتنا بڑا جرم ہے! اس کے تو تصور سے بھی ایک مسلمان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ نے کتنے ایسے قوانین وضع کئے ہیں جو قرآنِ کریم کے صریحاً خلاف ہیں! ہم نے ان قوانین کی نشاندہی بھی کی لیکن آپ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ فرمائی۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ آپ اس کے متعلق خدا کے حضور کیا جواب دیں گے؟ اور اس سے اُمت جس قدر گمراہ ہوگی اس کا بوجھ کس کی گردن پر ہوگا؟

(۵) ـــــ آپ جو قوانین نافذ کر رہے ہیں وہ فقہ کے قوانین ہیں، یہ قوانین غیر اسلامی حکومتوں میں، ماہرینِ قوانین (انسانوں) نے وضع کئے تھے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین، کبھی قوانین و احکامِ خداوندی کا درجہ نہیں لے سکتے۔ انہیں اپنی اور غیر متبدل سمجھنا انہیں کلماتِ اللہ کا درجہ دے دینا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے اس شرک کے خلاف واضح الفاظ میں متنبہ کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا گیا ہے:۔
[اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)
ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔
اس آیت کی تفسیر میں حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی بڑا حقیقت کشا ہے۔

حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ عدیؓ! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔ اس وقت آپ سورۂ براۃ (توبہ) کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.....
تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کر دیتے ہیں، اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں اور تم اسے حرام سمجھنے لگ جاتے ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ بے شک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا۔ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔　(جامع بیان العلم۔ ابن عبدالبر)

آپ حضرات، ان احبار و رہبان (فقہا حضرات) کے وضع کردہ قوانین کو جو اسلام کا ابدی دین کہہ کر پیش کر رہے ہیں، یہ انہیں خدا بنا دینا ہے۔ جہاں تک ان حضراتؒ کے اقوال ہم تک پہنچے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ خود ان حضرات کا بھی اپنے فیصلوں کے متعلق یہ عقیدہ نہیں تھا۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے۔ ایک دن امام صاحب نے ابو یوسف سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے، اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔　(جلد ۱۴ - صفحہ ۳۵۲)

یہ تھا سرخیلِ فقہا، امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس میں خود امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔ یہ امام صاحبؒ کا مسلک تھا اور آپ حضرات ان کی طرف منسوب فقہ کو ابدی شریعتِ اسلامیہ قرار دے کر ملک میں نافذ کرا رہے ہیں!

فقہی قوانین کو اسلامی شریعت قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ
(۱) اُمت مختلف فرقوں میں بٹ گئی ——— ہر فرقہ اپنی فقہ کے اعتبار سے الگ فرقہ بنتا ہے۔

حالانکہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بالفاظِ صریح شرک قرار دیا تھا۔ ارشادِ خداوندی ہے..... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲) "مسلمانو! دیکھنا تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے، اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ مطمئن ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں اور باقی فرقے باطل"۔ اُس نے حضورؐ سے برملا کہہ دیا کہ ——— إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ..... (۶/۱۶۰) "اے رسول! جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک فرقہ سے متمسک ہو جائیں، تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ یعنی اگر مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو جائیں تو نہ خدا کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ باقی رہتا ہے نہ رسولؐ کے ساتھ ——— یہ ہے فقہی قوانین کو دین بنا لینے کا پہلا نتیجہ۔

(۲) فقہ نے اسلامی احکام کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی پبلک لاز اور پرسنل لاز، حالانکہ اسلام میں اس قسم کی تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سے اور تو اور، خود قرآنی احکام بھی مختلف شقوں میں بٹ گئے۔ (مثلاً) قرآنِ کریم میں احکامِ خداوندی کے لئے "کُتِبَ" کا لفظ آیا ہے، اب فقہی تقسیم و تفریق ملاحظہ فرمائیے۔

(ا) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ..... (۲/۲۱۶) "مسلمانو! تم پر جنگ فرض قرار دی گئی ہے"۔ فقہ کی رو سے یہ پبلک لا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔

(ب) كُتِبَ عَلَيْكُمْ ..... الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ..... (۲/۱۸۰) "مسلمانو! تم پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ تم اپنے والدین اور اقربین کے لئے وصیت کرو"——— فقہ کی رُو سے یہ پرسنل لا ہے۔

(ج) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ..... (۲/۱۸۳) "مسلمانو! تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ فقہ کی رُو سے اس کا تعلق نہ پبلک لاز سے ہے نہ پرسنل لاز سے۔ یہ عبادت ہے قانون کے دائرے میں نہیں آتی۔

ان میں فرق یہ ہے کہ پبلک لاز کو مدوّن بھی حکومت کرتی ہے اور نافذ بھی وہی۔ پرسنل لاز فقہ کی رو سے مدوّن ہوتے ہیں لیکن ان کا نفاذ قانونِ حکومت کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور عبادات کی جزئیات فقہ کی رُو سے مرتب ہوتی ہیں لیکن قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ نہیں ہوتیں۔

(۳) قرآنِ مجید کے احکام غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۶/۳۴) حتیٰ کہ خود رسول اللہؐ کو بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ مخالفین نے حضورؐ سے کہا کہ اگر آپؐ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں گے تو ہم مفاہمت کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ان کے جواب میں کہا گیا۔ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۚ ——— یہ قرآن میری کتاب نہیں۔ خدا کی کتاب ہے۔ جب یہ میری کتاب

ہی نہیں تو میں اس میں کس طرح ردّوبدل کر سکتا ہوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (میرا فریضہ تو اس کتاب کا اتباع کرنا ہے۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰/۱۵) اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میں بھی خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ ہے قرآنی احکام کے غیر متبدل ہونے کی کیفیت۔ لیکن ہماری فقہ اس میں بھی تبدیلیاں کر دیتی ہے۔ (مثلاً) اسی آیۂ وصیت کو لیجئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ (یعنی ۲/۱۸۰) اس میں کہا گیا ہے کہ ہر مسلمان پر وصیت کرنا فرض ہے۔ وہ اپنی وصیت اپنے پورے کے پورے ترکہ کے لئے کر سکتا ہے اور اپنے رشتہ داروں اور غیر رشتہ داروں میں سے جس کے حق میں چاہے کر سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن ہماری فقہ کا حکم ہے کہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی (۱/۳) ترکہ تک کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثوں میں سے کسی کے حق میں نہیں کی جا سکتی۔ یعنی فقہ، قرآنِ کریم کے حکم میں اس قدر کھلی ہوئی تبدیلی کرتی ہے اور فقہ کا یہی فیصلہ قانونِ حکومت کی رُو سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح کئی اور فقہی احکام بھی ہیں، جو یکسر قرآن کے خلاف ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس مملکت میں:-

۱- مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہوں۔

۲- جہاں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق ہو۔

۳- جہاں قرآنِ خالص کی جگہ فقہی احکام قانون کی حیثیت سے نافذ ہوں، خواہ وہ قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

نہ وہ مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے، نہ اس میں نافذ کردہ قوانین، اسلامی۔ وہ سیکولر سٹیٹ ہوگی اور اس کے قوانین کی اطاعت یا تعمیل، قوانینِ مملکت کی حیثیت سے کی جائے گی، نہ کہ اسلامی احکام کی حیثیت سے۔

اندریں حالات ہم اپنے ان کے واضعینِ قوانین سے بصد احترام پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ جو قوانین وضع کر رہے ہیں انہیں کس طرح اسلامی قوانین قرار دیتے ہیں ـــــ یعنی وہ قوانین جو ہزار سال پہلے کسی غیر اسلامی مملکت میں انسانوں (فقہاء) نے مرتب کئے تھے، اور جن کے قرآنی، ابدی اور غیر متبدل ہونے کی کوئی سند نہیں تھی! ہم نے دسمبر ۱۹۸۰ء میں یہی سوال، محترم تنزیل الرحمٰن سے بھی کیا تھا لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

(۰)

ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہی کہیں گے کہ آپ ایسا نیک نیتی سے کر رہے ہیں (لیکن نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے غلط کام کا نتیجہ تو بہرحال نقصان رساں ہوگا)۔ آپ کو غالباً اس کا علم نہیں کہ کچھ عرصہ سے اقوامِ مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف ایک گہری سازش کارفرما ہے۔ پچھلی صدی میں مسلمانوں کے مختلف ممالک میں ایسی فکری تحریکیں اُبھریں جن کا مقصد یہ تھا کہ جس اسلام پر ہزار سالہ ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے، اس کی جگہ قرآنی اسلام رائج کیا جائے ـــــ ترکی میں سعید حلیم پاشا، مصر میں مفتی عبدہٗ، ہندوستان میں سرسیدؒ، پاکستان میں اقبالؒ، وغیرہم ـــــ اسی تحریک کے علمبردار تھے۔ اقوامِ مغرب کو اس تحریک میں اپنی استعماریت اور سرمایہ داری کے لئے مہیب خطرہ نظر آتا تھا۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے ایک سکیم سوچی جس کا ملخص یہ ہے کہ عہدِ ملوکیت کے اسلام کو حقیقی اسلام قرار دے کر اس کی زور شور سے نشر و اشاعت کی جائے۔ (حالات مساعد

ہونے پر ہم اس کی تفصیل بھی پیش کریں گے)۔ اس کے لئے انہوں نے (FUNDAMENTALISM) کی اصطلاح وضع کی۔ یعنی اسلام کی اساسات کا احیاء۔ یہ جو آپ اس وقت ساری دنیا میں، اسلامی مراکز۔ اسلامی کانفرنسیں۔ اسلامی سیمینار۔ اسلامی مذاکرات۔ اسلامی لٹریچر کی بھرمار دیکھ رہے ہیں اور ان پر سیلاب کی طرح روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے، یہ سب اسی سکیم کی کارفرمائیاں ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ابھی کل تک ہماری مسجدوں کے دیوں میں تیل بھی اہلِ محلہ کی خیرات سے ڈالا جاتا تھا اور امام صاحب کا گذارہ انہی کے عطیات پر ہوتا تھا۔ آج یہ حضرات (تبلیغ اسلام کے نام پر) ہوائی جہازوں میں سفر کرتے اور یورپ اور امریکہ کے چوٹی کے ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں، تو یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے، اور اس "تبلیغ" پر کیوں خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ سب (FUNDAMENTALISM) کی تحریک کا صدقہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کی نگہ بصیرت نے اسے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں ان کی معرکہ آرا نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں ابلیس کے مشیر اپنی اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ ان کی معلومات کی رو سے "ابلیسیت" کو کس کس قسم کے خطرات درپیش ہیں ــــ مغرب کا جمہوری نظام، نازی ازم، فاشزم، روس کی اشتراکیت وغیرہ۔ وہ ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ یہ سب بجا اور درست، لیکن تمہاری نگاہ حقیقی خطرہ کو بھانپ نہیں سکی۔ مجھے ان تحریکوں میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس پر ان مشیروں کی آنکھوں میں خندۂ زیر دیدہ دیکھ کر اس نے کہا کہ جو کچھ تم سوچ رہے ہو اس کا مجھے احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

یہ تھا وہ خطرہ جو اقوامِ مغرب نے مذکورہ بالا مفکرین کی دعوت الی القرآن میں مضمر دیکھا۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے ــــ (FUNDAMENTALISM) کی تحریک ایجاد کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انہیں معتقدات کی نظری بحثوں میں الجھا دو۔ قدیم فقہی مسالک کو عینِ اسلام قرار دے کر انہیں اجاگر کرو۔ ابلیس کے الفاظ میں، انہیں اس قسم کی بحثوں میں اُلجھا دو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے! — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

ان مٹنے والے نقوش کو پھر سے اجاگر کر کے اس قوم کے سامنے لاؤ اور اس طرح ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اس قدر تاکیدات کے بعد اس نے پھر کہا کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اہلِ اُمّت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اور اس کے لئے آخری (اور حتمی) نسخہ یہ کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے!

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ ہے (FUNDAMENTALISM) کی سازش کا ماحصل جسے اس زور و شور سے پھیلایا جا رہا ہے اور جس سے ہم سطح بیں یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ دنیا میں اسلام کا احیا ہو رہا ہے۔ ہم سادہ لوحوں کو تاجرانِ مغرب کے دامہائے ہم رنگِ زمیں سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ برداشت کر لیں گے، لیکن اس اُمّت کا قرآن کی طرف آنا انہیں کبھی گوارا نہیں ہوگا ——— لیکن ان کے لئے گوارا ہو یا نہ، قیامت تو یہ ہے کہ ہمیں بھی گوارا نہیں۔ ہماری حالت ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ○ (۳۹/۴۵)

جو لوگ حیاتِ آخرت (خدا کی بازپرس) پر یقین نہیں رکھتے، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ حقِ حکومت خدا اور صرف خدا کو حاصل ہے، تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گذرتی ہے لیکن جب ان کے سامنے ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو قانون سازی میں خدا کے شریک قرار دیئے جاتے ہیں، تو خوشی سے اُن کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ اَلَّذِينَ مِن دُونِهِ "(خدا کے سوا قانون ساز) کون ہیں؟ فرمایا: أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ۚ...... (۴۲/۲۱)۔ وہ جو ان کے لئے قوانینِ شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ خدا نے انہیں اس کا کوئی اختیار نہیں دیا۔ کہا کہ یہ جو قوانین سازی میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں، ان سے پوچھو کہ

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ...... (۲۹/۵۱)

"جو کتاب خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے اور جو تمہارے پاس موجود ہے کیا وہ کافی نہیں (جو تمہیں اس کے ساتھ اوروں کو بھی ملانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟)"

یاد رکھو۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ...... (۶/۱۱۵)۔ خدا کی کتاب مکمل ہے۔ اس لئے اس کے احکام میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ غیر متبدّل بھی ہے، اس لئے ان احکام میں تبدیلی بھی نہیں کی جا سکتی۔ جو حکومت اس کتاب کے مطابق قائم ہوگی وہ اسلامی کہلائے گی اور وہ اس کتاب کی اقدار، اصول، احکام و قوانین کو اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنے کے طریق وضع کریگی۔ یہی اس کا فریضہ ہوگا اور یہی اس کے اختیارات کے حدود۔

ہم مملکتِ پاکستان میں قانون سازی کا فریضہ ادا کرنے والوں کی خدمت میں ایک بار پھر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری ان گذارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم بارگاہِ خداوندی میں بری الذمہ ہو سکیں کہ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي۔ (۷/۶۲) ہم نے پیغاماتِ خداوندی آپ حضرات تک پہنچا دیئے تھے۔ اور آپ بارگاہِ خداوندی میں یہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝ (۷/۱۷۲) ہمیں ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا ——— فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ اگر آپ آج اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تو ایک وقت آئے گا جب آپ ان باتوں کو یاد کریں گے۔ باقی رہے ہم، سو اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ○ (۴۰/۴۴)۔

(۰)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزمہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :- (نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔)
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #511, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۳	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام کمرہ ۲۳ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIP MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بارہ روڈ۔ فون ۷۲۶۵۹ مکان شیر افضل خان صاحب۔ تہکال بالا۔ جمرود روڈ (پشاور)
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ آکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۹۔ نظامی منزل
بہاولپور	(۱) ہر جمعہ ۸ بجے صبح (۲) ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پور رہائش گاہ اعظم سنز۔ مچھلی بازار } باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ بمعل لائنز
گجرات	(۱) ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (۲) ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/۱/۱ بی بھمبر روڈ --- باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ۔
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ... ۲۱۰۷۱)
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۲۵)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجیکل کلینک ۲۳/سی پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۵۵۲۶)

شرک

(پرویز صاحب کا ایک درس)

شرک کو اللہ تعالیٰ نے جرمِ عظیم قرار دیا ہے ـــــ ایسا جرم "جس کی بخشش نہیں ہو سکتی"۔ سوال یہ ہے کہ شرک کیا ہے اور وہ کیوں اس قدر سنگین جرم ہے۔ شرک کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ خدا کے سوا دوسروں کی پرستش کرنا شرک ہے اور اس کی محسوس اور بین مثال بُت پرستی ہے۔ ـــــ اور چونکہ مسلمان بتوں کو

شرک کا عام تصوّر

نہیں پوجتا اس لئے وہ مطمئن رہتا ہے کہ میں شرک کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوا شرک۔ اب رہی یہ بات کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسا سنگین جرم کیوں قرار دیا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ خدا بھلا اسے کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اوروں کی بھی پرستش کی جائے۔ یعنی اس سے چونکہ (معاذ اللہ) خدا کا کچھ بگڑتا ہے یا اس کی غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی کو اس کا ہمسر بنا دیا جائے اس لئے وہ اس جرم کو کبھی نہیں بخشتا۔ آپ غور کیجئے کہ اس توجیہہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک شرک پر ہی کیا موقوف ہے خدا کی عبادت۔ اس کے احکام کی فرماں برداری۔ حقوق اللہ کی ادائیگی وغیرہ کے سلسلے میں جو عام عقیدہ ہمارے ہاں رائج ہے اس کی رُو سے خدا کے متعلق تصور ہی یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے کچھ اپنے مقاصد ہیں جنہیں وہ اس طرح ہم سے پورے کرانا چاہتا ہے۔ جب ہم قرآن کریم کی وہ آیت سنتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ ہماری عبادت کریں۔ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ ۵۱/۵۶) تو اس سے ہمارے اس عقیدہ کو اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ خدا کے سامنے کوئی اپنا پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے ہمیں پیدا کر کے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ ہم اس کی عبادت کرتے رہیں۔ خدا کے متعلق یہ تصوّر صحیح نہیں،

خدا کے متعلق تصوّر

وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی کا محتاج نہیں (فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۳/۹۶) وہ جو احکام ہمیں دیتا ہے اس لئے نہیں کہ اس کی بجا آوری سے کچھ اس کا سنورتا ہے اور اگر ان کی تعمیل نہ کی جائے تو اس سے کچھ اس کا بگڑتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ ان احکام کی بجا آوری سے کچھ ہمارا ہی سنورتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے ہمارا ہی بگڑتا ہے۔ اس طرح خدا پر ایمان لانے سے بھی ہمارا ہی ایک عظیم مقصد حاصل ہوتا ہے اور اس سے انکار کرنے سے ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا جب اسے کوئی ماننے والا

نہیں تھا اور اگر آج بھی دنیا کے تمام انسان اس کی ہستی سے انکار کر دیں تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ (بلا تشبیہ) سورج اس زمانے میں بھی اسی طرح روشنی دیتا تھا جب کوئی آنکھ اسے دیکھنے والی نہیں تھی اور اگر آج ساری دنیا کے انسان اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں تو اس سے سورج کا قطعاً کوئی نقصان نہیں ہوگا خود انسانوں ہی کا نقصان ہوگا۔ لہٰذا خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے سے بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ "ایک خدا" ماننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے، اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے سے ہمارا ہی نقصان۔ اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی —— یہی مفہوم ہے اس ارشادِ خداوندی کا کہ شرک بخشا نہیں جا سکتا۔

شرک اور خوف

شرک کے اس "نقصانِ عظیم" کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن نے اپنے مخصوص معجزانہ انداز سے اس تفصیل کو دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ: سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (۳/۱۵۰) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔ ان پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ اسے شریک ٹھہراتے ہیں جس کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ شرک سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است — خوف را در شرک مضمر دیدہ است

اس کے برعکس ایک خدا کو ماننے والے (مومنین) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۶۲) ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یعنی شرک سے خوف پیدا ہوتا ہے اور توحید کا لازمی نتیجہ بے خوفی ہے۔ اور یہ مومن اور مشرک کا بنیادی خطِ امتیاز ہے۔ آیئے ہم قرآنِ کریم سے اس اجمال کی تفصیل دیکھیں۔

مظاہرِ فطرت کی پرستش

جب ذہنِ انسانی عہدِ طفولیت میں تھا (اور اب بھی دنیا کی بیشتر آبادی کا یہی عالم ہے) تو وہ فطرت کی مختلف قوتوں کو دیوی دیوتا سمجھ کر ان کے حضور جھکتا اور گڑگڑاتا —— بجلی چمکی اور وہ سہم کر ہاتھ باندھنے لگ گیا۔ بادل گرجا اور وہ ڈر کے سجدے میں گر گیا۔ دریا کی طغیانیوں کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ چیچک یا طاعون جیسی وبائی بیماریاں پھوٹیں اور اس نے کسی ان دیکھی قوت کے سامنے ڈنڈوت بجا لانا شروع کر دیا —— غرضیکہ ایک انسان تھا اور اسے اپنے چاروں طرف بلاؤں کا ہجوم نظر آتا تھا جن سے وہ ہر وقت ڈرتا کانپتا رہتا تھا۔ خوف —— ہر طرف سے خوف۔ ڈر، چاروں طرف سے ڈر۔ یہ تھی اس وقت انسان کی زندگی۔ اس سے بچنے کے لئے اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ ان ان دیکھی قوتوں کو "خدا" سمجھ کر انہیں راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ انہی ان دیکھی قوتوں کو اس نے محسوس شکلوں میں تراش کر بت پرستی شروع کر دی۔

انسان یہ کچھ کیوں کرتا تھا؟ اس لئے کہ وہ اپنے مقام سے آشنا نہیں تھا۔
قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ

قرآن کا پیغام

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ انسان ان سے کام لے سکے۔ اس نے داستانِ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا کہ "ملائکہ" انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ فطرت کی کوئی قوت ایسی نہیں جو انسان کے سامنے نہ جھک سکے۔ قرآن کی اس ایک انقلابی آواز نے ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا دیا۔ اس نے بتا دیا کہ جو انسان اپنے آپ کو فطرت کی ان قوتوں سے فروتر اور کمتر سمجھتا ہے وہ مقامِ آدمیت سے گرا ہوا ہے۔ انسان ان قوتوں (دیوی دیوتاؤں) کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے آیا ہے، ان کے سامنے جھکنے کے لئے نہیں آیا۔ جو ان کے سامنے جھکتا ہے اپنی تذلیل کرتا ہے۔ جو انہیں اپنے سے بڑا مانتا ہے اپنے شرف اور فضیلت سے انکار کرتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ فطرت کی قوتوں کو خدا ماننے والا اور ان کے محسوس مظاہر (مٹی اور پتھر کی مورتیوں۔ بتوں) کے سامنے جھکنے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا، اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔

فطرت کی قوتوں سے آگے بڑھے تو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنا شروع کر دیا، راجہ کو ایشور کا اوتار، سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) بادشاہوں کو خدائی اختیارات

انسانوں کی پرستش

کا حامل سمجھ کر ان کے حضور گڑگڑانا شروع کر دیا۔ انہیں ان داتا (رزق دینے والا) تصور کر کے ان سے ڈرنے اور کانپنے لگا۔ راجہ اور بادشاہ تو خیر بھی محسوس قوتوں کے مالک تھے، اس نے مذہبی پیشواؤں اور "روحانی مقتداؤں" کو قضا و قدر کے احکامات کا مالک سمجھ کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ انہیں راضی رکھنے کے لئے ان کے آستانوں پر جبہ سائی کرنے لگا اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کے تصور تک سے کانپنے لگا۔ خلاف ورزیِ احکام" تو ایک طرف، اگر ان کی شان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال گزرا تو سہم گیا کہ نہ معلوم اب کیا قیامت آجائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ

مُردوں کی پرستش

یہاں تک بڑھ گیا کہ زندہ انسان تو ایک طرف مُردوں تک کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع ہیں۔ ان کو خوش کر دینے سے انسان کی مرادیں بر آتی ہیں۔ ان کی ناراضگی سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں جن سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا بنا کر اس سے ڈرنا اور کانپنا انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ انسان ہونے کی جہت سے

مساواتِ انسانیہ

سب برابر اور یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (۷/۱۹۴) جن لوگوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تمہارے جیسے (خدا کے) بندے ہیں۔ تم انہیں جن قوتوں کا مالک سمجھتے ہو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے

سے زیادہ کچھ نہیں۔ مکڑی کے جالے کی کیفیت، یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے لیکن صاحب قوت کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (۲۹/۴۱) جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا کارساز و کارفرما سمجھ لیتے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے۔ لیکن کیسا گھر؟ دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گھر۔ انسان، جن اپنے جیسے انسانوں کو اپنا "خدا" بنا لیتا ہے ان کی اپنی قوت کچھ نہیں ہوتی، جب تک انہیں خدا مانتے رہیئے وہ خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں، جب انہیں ایسا ماننا چھوڑ دیجئے ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے ؎

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست چوں یکے اندر قیام آئی فناست

لہٰذا کسی انسان کو خدا بنا کر اس کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے۔ اور جب زندہ انسان کے سامنے جھکنے کی یہ کیفیت ہے، تو مردہ انسان کے حضور، زندہ انسان کا جھکنا اور اس کے سامنے گڑگڑانا انسانیت کی ایسی ذلت ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کو خدا بنا لینے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ اپنے ہاتھوں آپ ذلیل ہوتا ہے۔

مقامِ آدم

قرآن نے انسان سے کہا کہ تیری دنیا میں تجھ سے بلند مقام کسی کا نہیں۔ فطرت کی قوتیں سب تیری خادم ہیں، تو ان کا مخدوم اور مسجود ہے۔ باقی رہے انسان سو انسان ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے ہیں۔

ہاں! انسان سے بلند اور بالا مقام صرف ایک ہستی کا ہے اور وہ ہے ذاتِ خداوندی جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور خود انسان کو بھی۔ لیکن خدا کی ذات بھی ایسی نہیں جس سے انسان ڈرے اور سہمے۔

قانون والا خدا

ڈرنا اور کانپنا اس سے ہوتا ہے جس کے پاس قوت بے پناہ ہو لیکن وہ کسی قاعدے اور قانون۔ ضابطے اور اصول کا پابند نہ ہو۔ جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کس بات سے ناراض ہو جائے گا اور کس سے خوش۔ وہ کب خلعت بخش دے گا اور کب کھال کھنچوا دے گا۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات ایسی نہیں۔ اس کی قوتیں بے شک لامحدود ہیں لیکن وہ ان کا استعمال (معاذ اللہ) اندھا دھند نہیں کرتا، ان اصولوں کے ماتحت کرتا ہے جو اس نے خود وضع کئے ہیں اور جن پر وہ خود اپنی مرضی سے پابند ہے اور پابند بھی ایسا کہ ان سے کبھی ادھر ادھر نہیں ہٹتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۵/۴۳) اور تم خدا کے اصولوں میں کبھی تغیر و تبدل نہیں دیکھو گے۔ اگر تم اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کرتے جاؤ گے تو تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۔ (۱۰/۱۰۷) اگر قانونِ خداوندی کے مطابق تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچ رہا ہو تو کوئی نہیں جو اسے رفع کر سکے اور اگر اس کے قانون کے مطابق کچھ فائدہ پہنچ رہا ہو تو کسی کی طاقت نہیں جو اس نفع کو تم تک پہنچنے سے روک لے۔

غور کیجئے۔ جس صاحبِ اقتدار کی کیفیت یہ ہو کہ اس نے ہر کام کے نتیجے کے لئے غیر متبدّل قوانین مرتب کر دئے ہوں اور اس میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوتی ہو، اس کی مملکت میں رہنے والے

خوف سے مامون

انسان کس قدر خوف سے مامون ہوں گے۔ انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ وہ ڈریں گے تو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈریں گے (اس کو خشیۃ اللہ یا خدا سے ڈرنا کہتے ہیں) ____ جیسے ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ہم ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ہمارے لئے ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ____ اور چونکہ ساری کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے۔ اس میں کوئی اور قوت شریک نہیں (وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۱۸/۲۶) اس لئے قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والے کو نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت، ہے نہ کسی کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے کی حاجت ____ خواہ وہ فطرت کی کوئی قوت ہو، یا کوئی مردہ یا زندہ انسان۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ کائنات میں سر اٹھا کر چلتا ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے مستانہ وار گزر جاتا ہے۔ اس کے شرفِ انسانیت کو کہیں ٹھیس نہیں لگتی کسی مقام پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی وہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی زندہ شہادت ہوتا ہے۔ اسے ہر طرح کا امن حاصل ہوتا ہے (ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہے۔ اس کا مادہ ہی ا-م-ن ہے۔ مومن وہ ہے جو خود بھی امن میں ہو اور دوسروں کو بھی امن میں رکھے وہ نہ خود کسی کے سامنے جھکے نہ کسی کو اپنے سامنے جھکائے)

شرک کی دیگر اقسام

۴۔ لوگوں کے سامنے عام طور پر شرک کی ایک ہی شکل تھی، یعنی بت پرستی۔ لیکن قرآنِ کریم کی نگاہ دوررس اور جزرس؟ نے ان محسوس پیکروں سے آگے بڑھ کر ان "خداؤں" کی بھی نشاندہی کر دی جو انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ اور اس کے خون کے ذرات میں حلول کردہ ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ توحید نام ہے خالصتہً قوانینِ خداوندی کے اتباع کا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کو قانون کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟ اس کے جذبات! لہٰذا جو انسان قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے، قرآنِ کریم اسے بھی شرک قرار دیتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ جب انسانی جذبات قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی من مانی کرنے لگیں تو قرآن اسے شیطنت سے تعبیر کرتا ہے، اور شیطان کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کا غلبہ مشرکین پر ہوتا ہے (۱۶/۱۰۰) یعنی انسان کا، قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر خود اپنے جذبات کے پیچھے لگ جانا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک۔

اسی طرح قرآن نے فرقہ پرستی کو بھی شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱) اس لئے کہ اس میں بھی انسان، قوانینِ خداوندی کے اتباع کی بجائے اس انسان یا انسانوں کے گروہ کا اتباع کرتا ہے جن کی طرف وہ فرقہ منسوب ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسا شخص خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر اپنے فرقہ کے بانی ____ یا اس کے نمائندے کے کسی حکم کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رُو سے شرک کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا شرک ہے۔ مثلاً

(۱) فطرت کی قوتوں کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کی خادم اور تابع تسخیر ہیں انہیں انسان سے بلند و بالا سمجھنا، انہیں ان کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

(۲) تمام انسان، انسان ہونے کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ حیثیت دے دینا کہ دوسرے انسان اس کے سامنے جھکیں اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

(۳) "مُردہ بدستِ زندہ" عام محاورہ ہے اور حقیقت پر مبنی۔ لیکن مُردوں کو ایسا صاحبِ اقتدار سمجھ لینا کہ وہ زندہ انسانوں کے مقدرات کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، مُردہ کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

(۴) خدا کی ذات ایسی ہے کہ انسان اس کے قوانین کا اتباع کرے اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اس اطاعت اور اتباع میں کسی اور کو شریک سمجھ لینا خدا کو اس کے صحیح ——— بلند و بالا مقام سے نیچے لے آنا ہے۔

"کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے" کو عربی زبان میں ظلم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رُو سے سب سے بڑا ظلم، شرک ہے اور اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے جب کہا ہے کہ

"اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (۳۱/۱۳)

شرک ظلمِ عظیم ہے۔ اس میں کوئی شے اپنے اصلی مقام پر نہیں رہتی۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑ دیجئے، اس میں انسان اپنے بلند اور رفیع مقام سے اس بُری طرح گرتا ہے کہ اس کے شرف و مجد کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ دیکھئے

شرک سے پستی

قرآن نے اس حقیقت کو کیسے دل نشین انداز سے بیان کیا ہے جہاں کہا ہے کہ۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ——— جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے، زمین کی پستیوں پر آگرے ——— فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ۔ پھر اُسے کوئی (عقاب یا چیل) اُچک کر لے جائے۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱) یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہو، جسے تند و تیز ہوا اِدھر اُدھر اڑائے اڑائے پھرے اور کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے۔

آپ نے دیکھا کہ شرک انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ یہ اسے اس کے مقامِ آدمیت سے گرا کر ذلت و خواری کی انتہائی پستیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ یوں ڈرا سہما رہتا ہے جیسے چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے نیچے گر پڑا ہو۔ اور جس تیز چنگل والے پرندے کا جی چاہے اُسے اُچک کر لے جائے۔ وہ اس قدر بے وزن اور بے حقیقت ہو جاتا ہے کہ ہوا کا ہر تیز و تند جھونکا اسے جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھرتا ہے۔ شرک سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے اس انسان کی جسے خالقِ کائنات نے ایسا بلند اور مستحکم مقام عطا کیا تھا۔

اختیار و ارادہ

قرآن کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے اُسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے اور پھر اس کے اس شرف کا اس قدر احترام کیا ہے کہ وہ اس کے اس اختیار و ارادہ کو اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ وہ اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) تم اپنے دائرۂ اختیارات میں اپنی "مشیت" کے مطابق کام کرو۔ تم اپنے فیصلوں کے مطابق جس طرح جی میں آئے کرو۔ اور اس کے نتائج بھگتو۔ یہ ہے انسان کا مقامِ بلند۔ لیکن شرک میں انسان اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کہاں تک آگے جاتا ہے اور انسان کو کس قدر بلند مقام تفویض کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شرک سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اپنے فیصلوں اور کاموں کی ذمہ داری لینے سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں رہتی کہ وہ مردانہ وار کہے کہ ہاں! میں نے یہ کیا ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ اپنے اعمال کی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپ دے۔ سورۂ نحل میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۱۶/۳۵) اور جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرتے۔ دیکھا آپ نے! شرک سے انسان کے حوصلے کس قدر پست ہو جاتے ہیں۔

(۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ نکتہ واضح ہو گیا ہو گا کہ شرک سے مفہوم کیا ہے اور اس سے قرآن کریم نے اس شدت سے کیوں منع کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو کائنات میں بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ لیکن شرک سے انسان اپنے آپ کو اس بلند مقام سے گرا کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھے میں جا پہنچتا ہے۔

شرک کی خرابیاں

سورۂ اعراف میں ہے: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔ اگر انسان ہمارے پروگرام کے مطابق چلتا تو یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتا۔ وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ لیکن یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یعنی ہمارے قوانین کا اتباع کر کے دنیا میں سرفرازی سے چلنے کے بجائے اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور یوں شرف و مجد کی بلندیوں سے گر کر ذلت و خواری کی پستیوں میں جا پہنچتا ہے۔ یہ ہے شرک کا نتیجہ۔ یعنی اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خود انسان اپنے بلند مقام کو کھو دیتا ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اور کوئی نقصان بھی ہو اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب انسان اپنے مقامِ انسانیت ہی سے گر جائے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس ارشاد کا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴/۱۱۶) خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق انسان کے ہر غلط اقدام کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل سکتا ہے۔ لیکن جو نقصان شرک سے مرتب ہوتا ہے اس سے حفاظت نہیں مل سکتی۔ انسان اپنے مقام کو نہ کھوئے تو اس کی

(باقی بر صفحہ ۳۵)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (۱۹ جنوری تا ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ محترمہ مہرالنساء بیگم صاحبہ بذریعہ سلطان محی الدین کراچی	۳۰۰/-	۳۸۱۹
۲۔ خدابخش بلوچ صاحب ایڈووکیٹ ڈیرہ اسماعیل خان	۱۵۰/-	۳۸۲۰
۳۔ مطلبی احباب معرفت محمد اسلم صاحب بورے والا	۲۲۵/-	۳۸۲۱–۳۸۳۴
۴۔ ولی الرحمٰن صاحب۔ ابوظہبی	۱۰۰۰/-	۳۸۳۵
۵۔ محمد اشفاق صاحب لندن معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۲۳۵/۷۰	۳۸۳۶
۶۔ مقبول محمود فرحت صاحب 〃 〃 〃 〃	۲۳۵/۷۰	۳۸۳۷
۷۔ غلام عباس جعفری صاحب ڈیلے 〃 〃 〃	۱۱۷/۸۰	۳۸۳۸
۸۔ سعید اختر صاحب نارتھ ہولٹ 〃 〃 〃	۱۱۷/۸۰	۳۸۳۹
۹۔ اے کے آفریدی صاحب بذریعہ حبیب اللہ جان صاحب 〃 〃	۵۸۹/۵۰	۳۸۴۰
۱۰۔ اے آر آفریدی صاحب 〃 〃 〃 〃	۵۸۹/۵۰	۳۸۴۱
۱۱۔ ڈاکٹر مظہر محمود صاحب۔ راولپنڈی	۲۰۰۰/-	۳۸۴۲
۱۲۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۸۴۳
۱۳۔ 〃 مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۸۴۴
۱۴۔ خواجہ محی الدین صاحب۔ دہران	۱۰۰/-	۳۸۴۵
۱۵۔ ملک حنیف وہدانی صاحب۔ مری	۵۰/-	۳۸۴۶
۱۶۔ محمد ارشاد صاحب۔ چار دہان مری	۲۵/-	۳۸۴۷
۱۷۔ غلام محمد اعوان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام پنڈی گھیپ	۱۰۰/-	۳۸۴۸
۱۸۔ محترمہ بیگم عبدالکریم صاحبہ۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۸۴۹
۱۹۔ پیر دل خان عرف صدر بابا صاحب۔ کراچی	۵۰/-	۳۸۵۰
۲۰۔ محترمہ مسز نشاط مشتاق صاحبہ۔ کراچی	۵۰۰/-	۳۸۵۱
۲۱۔ عظمت شہزادہ صاحب۔ گوجرانوالہ معرفت بزم طلوع اسلام	۸۰/-	۳۸۵۲
۲۲۔ روشن عباسی صاحب لندن معرفت بزم طلوع اسلام لندن گوجرانوالہ	۶۸۸/۵۰	۳۸۵۳
۲۳۔ لیاقت علی جرال صاحب	۹۱۸/-	۳۸۵۴
۲۴۔ محمد افضل رازی صاحب لندن 〃 〃 〃 〃	۲۲۹/۳۰	۳۸۵۵
۲۵۔ مقبول محمود فرحت صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۲۹/۳۰	۳۸۵۶
محترم		
۲۶۔ عارف شریف صاحب۔۔ بذریعہ حبیب احمد جان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۱۴/۷۰	۳۸۵۷
۲۷۔ حاجی عزیز نور محمد صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۵۹/-	۳۸۵۸
۲۸۔ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام جلال پور جٹاں	۱۲۰۰/-	۳۸۵۹
۲۹۔ غلام مصطفیٰ صاحب معرفت 〃 〃 〃 〃	۱۰۰/-	۳۸۶۰
۳۰۔ میر علاؤ الدین صاحب 〃 〃 〃 〃 〃	۲۰۰/-	۳۸۶۱
۳۱۔ غلام حسین صاحب گجرات بزم طلوع اسلام گجرات	۱۰۰/-	۳۸۶۲
۳۲۔ زاہد حسین صاحب۔ برمنگھم یو کے	۶۸۹/۴۰	۳۸۶۳
۳۳۔ محترمہ ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۸۶۴
۳۴۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۸۶۵
۳۵۔ مولانا عبدالحی صاحب مردان بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۰/-	۳۸۶۶
۳۶۔ ہمایوں اختر صاحب۔ پیرس فرانس	۲۲۰/-	۳۸۶۷
۳۷۔ نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ راولپنڈی	۱۰۰/-	۳۸۶۸
۳۸۔ ضیاء الدین صاحب۔ سعودی عرب	۹۷/-	۳۸۶۹
۳۹۔ محمد اقبال صاحب لیاقت بازار۔ معرفت بزم طلوع اسلام کوئٹہ	۵۰/-	۳۸۷۰
۴۰۔ نیر اختر اعوان صاحب چمن 〃 〃 〃	۵۰/-	۳۸۷۱
۴۱۔ اقبال حسین صاحب ٹاؤن کالج لائبریری 〃 〃	۱۰/-	۳۸۷۲
۴۲۔ محترمہ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحب ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۸۷۳
۴۳۔ عبدالرشید لودھی صاحب۔ راولپنڈی	۵۰/-	۳۸۷۴
۴۴۔ چوہدری علی شیر چشتی صاحب (اپنے بزرگوں کی طرف سے) بہاولپور	۱۰۰/-	۳۸۷۹
۴۵۔ طاہر ابرار انصاری معرفت بزم طلوع اسلام کراچی	۵۰/-	۳۸۸۰

میزان =	۱۲۹۲۱/۳۰
سابقہ میزان =	۶,۶۸۹۴۳/۷۹
کل میزان =	۶,۸۱۸۶۵/۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وحدتِ ملّت!

(پرویز صاحب کی ایک تقریر)

یوں دیکھئے تو ساری دنیا میں انسان بستے ہیں جو (سب کے سب) ایک ہی نوع کے افراد ہیں۔ لیکن ان کے اختلافات پر نگاہ ڈالیئے تو ایسا دکھائی دے گا گویا دنیا کی آبادی مختلف قسم کی مخلوقات کا مجموعہ ہے جن میں سوائے شکل وصورت کے اور کوئی بات بھی مشترک نہیں۔ کہیں ان میں خاندانوں کا اختلاف ہے، اور ہر خاندان دوسرے خاندان کا دشمن ہے۔ کہیں ذاتوں اور برادریوں کا اختلاف ہے، اور ہر برادری دوسری برادری سے بَیر رکھتی ہے۔ کہیں قوموں کا اختلاف ہے اور ہر قوم دوسری قوم کو نگلنے کی فکر میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی قوم کے اندر سیاسی پارٹیوں کا اختلاف ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ ان تمام اختلافات سے اوپر چلئے تو مذہب کا اختلاف ہے، اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مٹانا فریضۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ پھر مذاہب کے اندر فرقوں کا اختلاف ہے، اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو جہنّم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ انسان کی نوع تو ایک ہے لیکن باہمی اختلافات سے اس طرح بٹی ہوئی ہے کہ ان میں کوئی شے (سوائے باہمی عداوت کے) بطورِ قدرِ مشترک دکھائی نہیں دیتی۔

نوعِ انسان کے اختلافات

قرآنِ کریم نے، اس طرح اختلافات سے بٹے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں اس کا علم و احساس بھی ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ..... (۴/۱)

خدا نے تم سب کو ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا ہے!

پیدائش کے اعتبار سے تم سب کی اصل ایک ہے۔ تم سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی شاخ کے پتّے ہو۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک درخت کی ایک شاخ، دوسری شاخ کی تباہی کی فکر میں رہتی ہو، اور ایک پتّا دوسرے پتّے کی گھات میں بیٹھا ہو کہ وہ کب غافل ہو اور میں اسے نگل جاؤں؟ درخت سرسبز و شاداب ہوتا ہے تو اس کی ہر شاخ اور ہر پتّے میں زندگی اور تازگی کی نمود ہوتی ہے۔ اگر وہ خشک ہوتا ہے تو اس کی ہر ٹہنی مُرجھا جاتی ہے۔

وحدتِ انسانیّت

یاد رکھو!

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ط (۳۱/۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھانا، ایک نفس (کی پیدائش اور بعث) کی طرح ہے۔

اس نے کہا کہ شروع میں تمام نوعِ انسان ایک برادری تھی لیکن اس کے بعد لوگوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط (۱۰/۱۹)

اور تمام نوعِ انسان ایک اُمّت (برادری) تھی۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے۔

اور اس طرح مختلف خاندانوں، قبیلوں، نسلوں، گروہوں، قوموں اور مذہبوں میں بٹ گئے۔ جب ان میں اس طرح اختلافات شروع ہو گئے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا تو خدا نے اپنی طرف سے حضراتِ انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ ان کے اختلافات مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالم گیر برادری بنا دیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط ..... (۲/۲۱۳)

تمام انسان ایک ہی برادری تھے۔ (پھر انہوں نے باہمی اختلافات سے تفرقہ شروع کر دیا تو) اللہ نے انبیاء کرام کو بھیجا جو انہیں (باہمی اتحاد اور یگانگت کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری دیتے تھے اور (اختلاف و افتراق کے تباہ کن عواقب سے) آگاہ کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ اللہ نے ضابطہ، قوانین بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

ان تمام انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک ہی تھا۔ یعنی وحدتِ انسانیت۔ یہی پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، یہی حضرت ابراہیمؑ کا۔ یہی حضرت موسےٰؑ نے کہا تھا، یہی حضرت عیسےٰؑ نے۔ اور آخر الامر یہی پیغام نبی اکرمؐ نے نوعِ انسان تک پہنچایا تھا۔

انبیاءِ کرام کی دعوت

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ۔ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط ..... (۴۲/۱۳)

(اے رسول) اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا۔ اور وہی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے۔ اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔ (وہ حکم یہ تھا کہ) خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدین) کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو۔

(یہی دعوت تمہاری ہے) لیکن جس بات کی طرف تو انہیں بلاتا ہے مشرکین پر وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔

یہاں اس بات کو ذرا غور سے سمجھئے کہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی دعوت

مشرکین پر بڑی گراں گذرے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔

چونکہ ان انبیاء کرامؑ کا پیغام ایک تھا اس لئے یہ سب کے سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ یہی وہ جماعت تھی جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۳)

یہ تمہاری جماعت ایک ہی برادری ہے۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ سو تم میری محکومیت اختیار کرنا۔

جو لوگ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی اس دعوت پر ایمان لاکر باہمی تفرقے مٹا دیتے تھے اور اس طرح ایک خدا کی محکومیت اختیار کر کے، ایک برادری بن جاتے تھے، وہ ایک اُمت قرار پاتے تھے۔ جو اس دعوت سے انکار کر کے، اپنے اپنے اختلافات پہ قائم رہتے تھے، وہ دوسرا فریق بن جاتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

دو جماعتیں

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم سے کچھ لوگ نہ ماننے والے (کافر) بن گئے اور کچھ ماننے والے (مومن) ہو گئے۔

جو لوگ اس دعوت پر ایمان لاکر اپنے اختلافات مٹا دیتے تھے، ان میں باہمی تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے اندر، تفرقہ کتنا سنگین جرم ہے، اس کا اندازہ بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے لگائیے جسے قرآن کریم نے سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی جگہ حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کا نگران بنا کر چھوڑ گئے۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

تفرقہ سنگین جرم ہے

بنی اسرائیل اپنی جہالت سے سامری کے فریب میں آ گئے اور انہوں نے گئوسالہ (بچھڑے) کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے انہیں نرمی سے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔ جب حضرت موسیٰؑ واپس آئے تو وہ قوم کی اس حالت کو دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا اَلَّا تَتَّبِعَنِ (۲۰/۹۲) جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ اس طرح گمراہ ہو رہے ہیں، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس سے روکا کہ جس طرح میں ان پر سختی کیا کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح کرو؟

آپ نے سوال سن لیا؛ اب اس کا جواب سنیئے۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ یہ جواب ایک نبیؑ کی طرف سے دیا جا رہا ہے، اور دوسرا نبیؑ اس جواب کو سن رہا ہے۔ جواب یہ تھا کہ

اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ (۲۰/۹۴)

میں اس سے ڈر گیا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری بات یاد نہ رکھی۔

اس جواب سے حضرت موسیٰؑ مطمئن ہو گئے۔ یعنی انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ حضرت ہارونؑ نے اچھا کیا کہ تھوڑے سے وقت کے لئے قوم کی جہالت کو گوارا کر لیا اور انہیں تفرقہ سے بچا لیا۔ یعنی قوم میں تفرقہ ایسا شدید

جرم ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کچھ وقت کے لئے شرک جیسی جہالت کو بھی برداشت کر لیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کی اس جہالت کو صرف حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک (عارضی طور پر) گوارا کر لیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ (معاذ اللہ) مستقل طور پر حق کو چھوڑ باطل پرستی پر راضی ہو گئے تھے تاکہ قوم میں اتحاد قائم رہے۔ حق کو چھوڑ کر اتحاد پیدا کرنا، جائز قرار نہیں پا سکتا۔ حضرت ہارونؑ نے بنی اسرائیل کو ان کی جہالت پر روکا تھا۔ البتہ سختی نہیں کی تھی۔ ان سے حضرت موسیٰؑ کی واپسی تک نرمی برتی تھی۔ بہرحال قرآن کریم کے اس بیان سے واضح ہے کہ اس کی نگاہ میں تفرقہ کس قدر سنگین جرم ہے۔

قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک نبی آتا اور اپنے متبعین کے اختلافات مٹا کر انہیں اُمتِ واحدہ بنا جاتا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد، وہ لوگ آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے۔ وہ کیوں ایسا کرتے؟ اس کا جواب اس نے ایک لفظ میں دیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ط (۴۲/۱۴) خدا کی طرف سے وحی آ جانے کے بعد، وہ باہمی ضد کی بنا پر آپس میں تفرقہ پیدا کر لیتے۔" یعنی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی نگاہوں سے حقیقت گم ہو جاتی۔ یا وہ وحدتِ اُمت اور باہمی اخوت و اُلفت کی برکات کے قائل نہ رہتے، اس لئے تفرقہ پیدا کر لیتے۔ بالکل نہیں۔ وہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے، لیکن محض ایک دوسرے کی ضد سے، ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کے تحت، دوسروں سے بڑا بننے کے خیال سے، باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔ اس طرح اُمت، مختلف فرقوں میں بٹ جاتی اور ان کے مذہبی پیشوا یا سیاسی لیڈر، ایک دوسرے کی ضد سے، فرقہ بندی کی گرہوں کو مضبوط کرتے رہتے۔ اسی میں ان کی "چودھراہٹ" کا راز تھا۔ اس سے وہ بڑے بنتے تھے۔

نبی کے بعد اختلافات

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ تا آنکہ نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسان کے ان اختلافات کو مٹا کر، انہیں اُمتِ واحدہ بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو قرآن کریم ملا جو ان تمام امور کو کھول کھول کر بیان کرتا تھا جن میں لوگ اختلاف کرتے تھے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۶/۶۴)۔

اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے سامنے وہ باتیں کھول کر بیان کر دے جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ جو لوگ (اس طرح اپنے اختلافات مٹا کر) اس کتاب پر ایمان لے آئیں گے یہ ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کریگی اور ان کے لئے موجبِ رحمت بنے گی۔

اُمتِ مسلمہ

چنانچہ اس طرح نبی اکرمؐ نے ایک اُمت متشکل فرمائی جس میں کوئی باہمی اختلاف نہیں تھا۔ ان کا ضابطہ حیات (قرآن کریم) ایک تھا۔ ان کا نظامِ زندگی ایک تھا۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ ان کا راستہ ایک تھا۔ منزل ایک تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (۲/۱۴۳)۔ اور

اس طرح ہم نے تمہیں ایسی اُمّت بنا دیا جو تمام افرادِ انسانیہ سے یکساں فاصلہ پر ہے (یعنی اس کے نزدیک تمام انسان ایک جیسے ہیں)۔ اس اُمّت کا فریضہ ہے کہ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہے۔ اور ان کے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو۔

یہ اُمّت بنائی اور اس سے تاکیداً کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ تم سب خدا کے اس ضابطۂ حیات (قرآنِ کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ اس سے تمہاری وحدت قائم رہے گی۔ وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور دیکھنا! آپس میں تفرقہ پیدا نہ کر لینا۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً۔ تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ اور اس طرح اس نے اپنے فضل و عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ۔ تم تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ سو اُس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳/۱۰۳) اس طرح اللہ اپنے احکام و دلائل تم سے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سیدھے راستے پر چلتے رہو۔

قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ جلیلہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ان میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ باہمی اختلافات اور تفرقہ سے تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اس میں گویا ہی چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ قرآنی تعلیم کے ذریعے، ان کے دلوں سے عداوت کی آگ نکال کر، اس کی جگہ ایک دوسرے کی اُلفت کی ٹھنڈک پیدا کر دی اور اس طرح، انہیں ایک ایسی اُمّت بنا دیا جس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہ تھا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ان میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ یہ سب بھائی بھائی تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے نفرت، بُغض، حسد اور عداوت کے جذبات نہیں تھے۔ ان کا نظام ایک تھا۔ ان میں الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔

ان سے کہہ دیا کہ دیکھو! اب تم میں کوئی تفرقہ نہیں رہا۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس ہے۔ یہ اختلافات کو مٹانے کے لئے آئی ہے۔ اس لئے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۳/۱۰۵) اب تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد، فرقے پیدا کر لئے اور باہمی اختلاف کرنے لگ گئے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔

وحدت کی تاکید

ان سے اس سے بھی زیادہ تاکید سے کہا گیا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (۳۰/۳۱) دیکھنا تم (خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد) پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ کوئی شخص خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝ (۱۲/۱۰۶)۔ لوگوں میں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ، مشرک بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ

بات اس لئے نہیں آتی کہ تم سمجھتے ہو کہ مشرک وہی ہوتے ہیں جو بتوں کو پوجتے ہیں۔ لیکن شرک اتنا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جس میں ایمان کے مدعی بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ شرک کیا ہے؟ غور سے سنیئے۔ ارشاد ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ دیکھنا! تم کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا — مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲) ۔ فرقہ بندی سے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک پر اترا تا ہے۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ میں جنتی ہوں، باقی سب جہنمی ہیں۔

فرقہ بندی شرک ہے

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے دین میں اختلاف پیدا کرنا اور فرقے بنانا کس قدر سنگین جرم ہے؟ آپ نے شروع میں دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ آپ جو اتحاد اور اتفاق، وحدت اور یگانگت کی دعوت دیتے ہیں۔ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۔ (۴۲/۱۳) یہ بات مشرکین پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ یہ مشرکین کون ہیں جن پر وحدتِ اُمت کی دعوت گراں گزرتی ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں تفرقہ پیدا کریں اور فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں شروع کر دیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۔ (۶/۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود ایک گروہ بن گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

کس قدر واضح ہیں قرآن کریم کے یہ ارشادات کہ جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں!

(۱) وہ توحید پرست نہیں، مشرک ہیں۔ اور

(۲) خدا کے رسولؐ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی ان سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے، نہ خدا کے رسولؐ کا کوئی واسطہ!

رسول اللہؐ کی زندگی میں ایک مرتبہ منافقین نے اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک مسجد بنائی۔ سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس مسجد کے متعلق کیا ارشاد فرمایا۔ سورۂ توبہ میں ہے وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا ۔ وہ لوگ جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ اس سے (اسلام کو) مضرت پہنچائی جائے۔ اور کفر کی راہ اختیار کی جائے۔

یہ کفر کی راہ، اور اسلام کے لئے ضرر کا موجب کیا چیز تھی؟ وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ۔

مسجدِ ضرار

انہوں نے یہ مسجد اس لئے بنائی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔ یہ ہے کفر کی راہ۔ یہ ہے وہ خطرہ جس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ مسجد نہیں۔ إِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ ۔ یہ اس شخص کے لئے کمین گاہ ہے جو اس

سے پہلے خدا اور اس کے رسولؐ کے لئے جنگ کرتا رہا ہے کہ وہ اس کی اوٹ میں، بیٹھ کر، اسلام کے قلعہ پر گولہ باری کرے۔ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ۔ یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے بڑے نیک ہیں۔ ہم یہ سب کچھ کارِ خیر سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۔ اللہ اس کی بشارت دیتا ہے کہ یہ لوگ پکے جھوٹے ہیں۔ لہٰذا اے رسولؐ! لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا (۹/۱۰۸-۱۰۷)۔ تم ہرگز ہرگز اس مسجد میں قدم نہ رکھنا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رُو سے اُمّت میں تفرقہ پیدا کرنا، کتنا بڑا جرم ہے، اتنا بڑا جرم کہ اگر کوئی مسجد بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب بنے تو اس مسجد میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ وہ مسجد نہیں، ایسی کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر، دشمنانِ دین، حصارِ ملت پر گولہ باری کرتے ہیں۔

ایک طرف اس اُمّت کو تفرقہ اور اختلافات سے بچنے کی اس قدر سخت تاکیدات کیں اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے دل پر اچھی طرح منقوش کر دی کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) یاد رکھو! سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔

محمدؐ اللہ کا رسول۔ اور جو لوگ اس کے ساتھی ہیں، وہ کفار کے مقابلہ میں (چٹان کی طرح) سخت ہیں اور آپس میں نہایت نرم دل اور مرحمت کوش۔

ان کے باہمی اتفاق، یک جہتی، اور باہم پیوستگی کا یہ عالم ہے: كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝ (۶۱/۴) گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ تھی وہ اُمّت جسے قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ اس امت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی الگ الگ پارٹیاں نہیں تھیں۔ حضورؐ کو ان کی وحدت اور باہمدگر محبت اور اُلفت کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ

حجۃ الوداع کا خطبہ

اے لوگو! یقیناً تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی تم سب اصل کے اعتبار سے ایک ہو) عربی کو عجمی پر، اور عجمی کو عربی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

تمہارا خون اور تمہارا مال قیامت تک اس طرح (ایک دوسرے پر) حرام ہے جس طرح یہ دن، اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام (واجب الاحترام) ہے۔

پھر فرمایا:-

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہیں ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ ——— کتاب اللہ!

(صحاح۔ بحوالہ سیرۃ النبیؐ۔ علامہ شبلی۔ جلد دوم ص ۱۵۶-۱۵۲)

مسلمانوں کے خون کے واجب الاحترام ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآنِ حکیم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا ۔ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۹۳)

اور جو (مسلمان) کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ان تاکیدی احکام کے ساتھ نبی اکرمؐ نے اس اُمتِ واحدہ کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ پھر اس اُمت سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ وحدت اور اتحاد، صرف نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہے۔ حضورؐ کے بعد اس میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ اُمت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ سکتی ہے۔ ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج۔ محمدؐ بجز اس کے نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گذرے ہیں۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ج سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سارا نظام اور اُمت کی وحدت آپؐ کی زندگی تک تھی) پھر سے اُسی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے (اور فرقوں اور گروہوں میں بٹ جاؤ گے) وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ط (۳/۱۴۴) اور جو کوئی اس روشِ کہن کی طرف پلٹ جائے گا تو وہ اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے (کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا)۔

(۰)

یہ تھی وہ اُمتِ واحدہ جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا۔ اس کے بعد، تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے کی طرف اُلٹیئے اور دیکھئے کہ آج اُسی اُمتِ واحدہ کی کیا صورت ہے؟ تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو آسمان کے تاروں کی طرح اَن گنت۔ (کم از کم نوّے کروڑ کا تو عام اندازہ ہے)۔ جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے دیکھئے تو کرۂ ارض کے بیچوں بیچ، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ لیکن اختلافات کو دیکھئے تو انسان محوِ حیرت رہ جائے کہ کیا یہ وہی اُمت ہے جس کی وحدت کے متعلق قرآنِ کریم نے اتنے تاکیدی احکام دیئے تھے؟ کہیں نسلوں کا اختلاف ہے ——— یہ مغل، وہ پٹھان، یہ ترک وہ عرب ——— کہیں قومیتوں کا اختلاف ہے ——— یہ مصری وہ ایرانی۔ یہ عراقی

ہماری حالت

وہ حجازی ۔ یہ ہندی وہ چینی ——— یہ تو رہے نسلی اور وطنی اختلافات ۔ اس سے آگے بڑھئے تو ایک ہی ملک کے اندر ذاتوں اور برادریوں کے اختلاف ——— شیخ ، مرزا ، راجپوت ، پٹھان ، جاٹ ، ارائیں ——— پھر صوبائی اختلاف ——— سندھی ، پنجابی ، سرحدی ، بلوچی ——— ان سب اختلافات سے اوپر ، اور سب سے گہرا مذہبی فرقہ بندی کا اختلاف ——— یہ شیعہ وہ سُنّی ۔ یہ حنفی وہ وہابی ۔ یہ دیوبندی وہ بریلوی ۔ یہ اہلِ حدیث وہ اہلِ قرآن ——— ان کے علاوہ سیاسی پارٹیوں کے اختلافات ——— جب انسان اس اُمت کو دیکھتا ہے جسے نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا ، اور اس کے بعد اِس اُمت پر نظر ڈالتا ہے جو آج کل ہمارے سامنے ہے ، تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے ——— یقیناً آسمان کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہیں دیکھا ہوگا ! یہ اختلافات کیسے رونما ہوئے ۔ اور اُمتِ واحدہ ، اس قدر تاکیدات کے باوجود ، اتنے ٹکڑوں میں کیسے بٹ گئی ، یہ ایک جگر پاش داستان ہے جسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے بعد کیا پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے ؟ اور اگر ہو سکتی ہے تو کس طرح ؟

کیا یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے (یعنی اس سوال کا کہ یہ اختلافات مٹ کر اُمت پھر سے اُمتِ واحدہ بن سکتی ہے یا نہیں) تو اس کے جواب کے لئے قرآنِ کریم کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے تیرے اوپر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تو لوگوں پر ان باتوں کو واضح کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں ۔

یعنی قرآنِ کریم کا دعوےٰ یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے اختلافات کو مٹانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے ۔ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اختلافی امور کو واضح کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے بتا دے ۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم قرآن کی موجودگی میں یہ کہیں کہ ہمارے اختلافات کے مٹنے کی کوئی شکل نہیں ، تو اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) قرآن کا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ وہ اختلافات مٹا سکتا ہے ، اور یا یہ کہ قرآن کے اس دعوےٰ پر ہمارا ایمان نہیں ۔

ضرار یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا عقیدہ اور مسلک قرآنِ کریم کے مطابق ہے ۔ اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود قرآنِ کریم میں (معاذ اللہ) اختلافی باتیں موجود ہیں ، جبھی تو اس سے ہر فرقہ کو اس کے مسلک کی تائید مل جاتی ہے ۔ لیکن یہ چیز خود قرآنِ کریم کے دعوےٰ کے خلاف ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ بہت سے اختلافات پاتے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اس سے مختلف فرقوں کو اپنے اپنے مسلک کی تائید میں سند نہیں مل سکتی۔

(۲) قرآنِ کریم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے اختلافات مٹا دے۔

لیکن — کس طرح

اس سے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ اختلافات مٹ کس طرح سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) تم جس بات میں بھی اختلاف کرو، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ یعنی ہر اختلافی معاملہ میں فیصلہ خدا سے لینا چاہیئے۔ "خدا سے فیصلہ لینے" کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب سے فیصلہ لیا جائے۔ ہر اختلافی معاملہ میں قرآنِ کریم کو حَکَم مانا جائے۔ اسے ثالث تسلیم کیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے فیصلہ کس طرح لیا جائے؟ کیا اس طرح کہ جن دو فرقوں یا پارٹیوں میں اختلاف ہو، وہ اپنے اپنے طور پر قرآنِ کریم سے فیصلہ لے لیں؟ اس طرح تو اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ ہم آئے دن، مختلف فرقوں کے مناظرہ کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ دونوں فریق، قرآن کی آیات پیش کرتے ہیں، لیکن یہ اُسے کہتا ہے کہ تم نے قرآن کے غلط معنی کئے ہیں یا غلط مفہوم لیا ہے، اور وہ اسے بھی الزام دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دن بھر مناظرہ ہوتا رہتا ہے اور شام کو اس کا خاتمہ اکثر جھگڑے اور فساد سے ہوتا ہے۔ ہزار برس سے یہ مناظرے ہو رہے ہیں لیکن ان سے کوئی فرقہ مٹ نہیں سکا۔ بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم سے فیصلہ لینے کا یہ طریق صحیح نہیں۔ اختلافی امور میں فیصلہ کے لئے کسی تیسری پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کو حَکَم یا ثالث کہتے ہیں۔ یہ وہ طریق تھا جسے نبی اکرمؐ کے زمانے میں خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا تھا۔ اس نے حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۴/۶۵)۔

ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت

تیرے رب کی قسم ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب اپنے اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا ثالث (حاکم) نہ بنائیں۔ پھر تیرے فیصلہ سے اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے (بہ طیبِ خاطر) سرِ تسلیم خم کر دیں۔

مومنین پر یہ شرط عائد کی، اور نبی اکرمؐ کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ کسی اختلافی معاملہ میں فیصلہ کرانے کے لئے تیرے پاس آئیں تو فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ .... (۵/۴۸) تو ان میں قرآنِ کریم کے

مطابق فیصلہ کیا کرے۔"

یہ تھا وہ عملی طریق جس سے اُمّت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا تھا۔ لیکن یہاں یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ عملی طریق تو رسول اللہؐ کی زندگی میں کارفرما تھا۔ رسول اللہؐ کے بعد کون سا عملی طریق اختیار کیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب قرآن کریم نے خود ہی دے دیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ..... (۳/۱۴۴)۔ کیا اگر کل کو (رسول اللہ) وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں، تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اپنے پرانے طریقے کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہی عملی طریق جو رسول اللہ کی زندگی میں رائج تھا، حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اسلام کا نظام حضورؐ کی طبیعی زندگی تک محدود نہیں تھا۔

حضورؐ کے بعد!

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ حضورؐ کے بعد، اس سلسلہ کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم نے خود ہی دے دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نبی اکرمؐ کا فریضہ یہ تھا کہ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ۔ (۷/۱۵۷) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔ یعنی جن امور کو قرآن نے صحیح ٹھہرایا ہے وہ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور جنہیں اس نے غلط قرار دیا ہے وہ لوگوں کو ان سے روکتا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہی فریضہ اُمّت کا قرار پاجاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ۔ (۳/۱۱۰) "تم بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ قرآن کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو"۔ اسی اُمّت کو خدا نے اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے۔ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ (۳۵/۳۲)۔ "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے چن لیا تھا"۔ لہٰذا، رسول اللہؐ کے بعد، اُمّت کا فریضہ قرار پا گیا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کے لئے ایک حَکم (ثالث) کی طرف رجوع کیا کریں جو ان امور کا فیصلہ

قرآنی نظامِ حکومت

قرآن کریم کے مطابق کرے۔ یعنی یہ اُمّت "باہمی مشورہ سے" (۴۲/۳۸) ایسا نظامِ حکومت قائم کرے جس میں تمام اختلافی امور کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے رہیں۔ چنانچہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا جو فریضہ سب سے پہلے رسولؐ کا اور حضورؐ کے بعد اُمّت کا قرار دیا گیا ہے، وہی فریضہ اسلامی حکومت کا قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے:۔

اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ ..... (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں تمکن عطا کریں گے تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور نہی سے روکیں گے۔

نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد اُمّت نے، باہمی مشورہ سے، اسی قسم کی حکومت قائم کی تھی۔ جسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرنے میں جو فرائض اپنی زندگی میں رسُول اللہؐ نے سرانجام دیئے تھے، حضورؐ کی وفات کے بعد وہی فرائض "رسول اللہؐ کا جانشین" (خلیفۃ الرسولؐ) سرانجام دیتا تھا۔ یعنی اسلامی حکومت (خلافتِ علیٰ منہاجِ رسالت) لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے قرآنِ کریم کے مطابق کرتی تھی۔

جانشینانِ رسُولؐ

جب اُمّت نے اس عملی طریق کو چھوڑ دیا تو اس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اب ان اختلافات کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ پھر سے اسی قسم کی حکومت قائم کی جائے۔ یعنی ایسی حکومت جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرے۔ جب ہم نے یہ عملی طریق اختیار کر لیا تو قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ سچا ثابت ہو کر سامنے آجائے گا کہ یہ کتاب نوعِ انسان کے اختلافات مٹانے کے لئے آئی تھی۔ اور اس میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ اُمّت کے اختلافات مٹا سکے۔

سیاسی پارٹیاں

قرآنی نظامِ حکومت میں سیاسی پارٹیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔ یہ پارٹیاں وحدتِ اُمّت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے پارٹی بازی کو سنگین جرم قرار دیا ہے۔ (مثلاً) جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ فرعون کے خلاف اپنی مہم شروع کریں تو فرعون کے جرائم میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔ (۲۸/۴) "فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے اور اس کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے"۔ یعنی فرعون کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اسے اس سے روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا گیا۔ قرآن نے کسی ملک میں پارٹیوں کے وجود کو، اس ملک کے لئے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ۔ ان سے کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ یا تمہاری پارٹیاں بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے اور (اس طرح) تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۶۵) "دیکھو! ہم کس طرح ان احکام و دلائل کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ بات کو سمجھ سکیں"۔

اس نظامِ حکومت میں ساری اُمّت شریک ہو گی۔ یعنی یہ ساری اُمّت کے باہمی مشورہ سے قائم ہو گا، اور تمام اُمور کے فیصلے، نمائندگانِ اُمّت کے باہمی مشورہ سے، قرآنِ کریم کے مطابق کئے جائیں گے۔ اس میں حکومت کسی خاص پارٹی کی نہیں ہو گی۔ نہ ہی حکومت کے مقابلہ میں کوئی پارٹی ہو گی جو ہر وقت اس فکر میں لگی رہے کہ کسی طرح حکومت کو ناکام بنا کر، خود حکومت کی کرسیاں سنبھال لے۔ بغیر کسی پارٹی کے اُمّت کی مشترکہ حکومت، یہ ہے قرآنی نظام کی خصوصیت۔

اس وحدت سے ذاتوں اور برادریوں کی کشمکش ختم ہو جائے گی اور اس سے سندھی اور پنجابی، سرحدی اور بلوچی کا تفرقہ مٹ جائے گا۔ یہ سب قطرے، اُمّت کے سمندر میں مل کر، خود سمندر بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنے آپ کو مسلمان کہے گا کہ یہی نام ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔ (هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ (۲۲/۷۸)، اور مسلمان اور مسلمان میں کوئی تفریق یا مغائرت باقی نہیں رہے گی۔ سب آپس میں ——— بھائی بھائی ہوں گے ——— ایک دوسرے کے خیر خواہ، اور خدا کے سپاہی۔ یعنی دنیا میں حق کے محافظ۔

اُمّت میں از سرِ نو وحدت پیدا کرنے کے پروگرام کی ابتدا کسی ایک ملک سے ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے پاکستان سے زیادہ موزوں اور کوئی خطۂ زمین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان کا مطالبہ، تمام

پاکستان میں وحدتِ ملّت

مسلمانانِ ہند نے، نسلی، لسانی، قبائلی، صوبائی، مذہبی فرقہ دارانہ غرضیکہ ہر قسم کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، بیک زبان کیا تھا۔ اور اس مطالبہ کی بنیاد اس آرزو پر تھی کہ ہم سب اس آزاد مملکت میں اسلامی انداز کی زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہم مختلف قسم کے مفادات میں اُلجھ کر رہ گئے اور وحدتِ ملّت، اور اسلامی طرزِ زندگی کے بلند مقاصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اگرچہ اس کی آرزو ہمارے دلوں میں مچلتی رہی اور یہ تمنّا ہمارے لب پر دعا بن کر آتی رہی۔ مثلاً (صدر مملکتِ پاکستان) فیلڈ مارشل

وحدتِ ملّت

محمد ایوب خان (مرحوم) نے، قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے عالمِ اسلام کی توجہ منعطف کرائی تھی جب انہوں نے کہا تھا کہ

براہِ کرم ایک بات ضرور یاد رکھئے۔ ہم دنیا میں جہاں بھی ہوں، بہ حیثیتِ مسلمان، ہم پر اللہ کی طرف سے، اور خود اپنی طرف سے، ایک وفا شعاری عائد ہوتی ہے جو ہر وفا شعاری سے فائق اور بلند ہے۔ ہماری یہ وفا شعاری ہے ایمان کے ساتھ۔ یہ وہ عہدِ وفا ہے، جو تمام مسلمانانِ عالم کو، ہر قسم کے خارجی تنازعات یا سیاسی اختلافات کے باوجود، باہمی مودّت اور اُلفت کے محکم اور ناقابلِ شکست رشتہ میں منسلک کئے ہوئے ہے۔ یہ رشتہ، تمام سیاسی رشتوں سے زیادہ قیمتی اور مضبوط ہے۔ ہم میں جب تک یہ (ایمان کا) رشتہ قائم ہے، الجزائر کے مسلمانوں پر تشدد، فلسطینی مہاجرین کے مصائب، کشمیری مسلمانوں پر مظالم اور اسرائیلی حکومت کی طرف سے (آئے دن کی) دھمکیاں، پوری کی پوری ملّت کے دل میں یکساں طور پر جذباتِ ہمدردی پیدا کرنے کا موجب ہوں گے۔ آیئے، ہم خدا سے دعا کریں کہ باہمی محبت اور اُلفت کا یہ سرچشمہ، دن بدن وسیع اور گہرا ہوتا چلا جائے اور خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے کہ ہم ایسی متاعِ گراں بہا کو، وقتی مفاد یا ہنگامی جذبات کی قربان گاہ پہ ذبح کر دیں۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

لیکن افسوس کہ ان دعاؤں نے آج تک عملی شکل اختیار نہ کی۔

تتمہ:- پرویز صاحب کی یہ تقریر ۱۹۶۷ء کی تھی۔ اس کے بعد ملّت میں افتراق و انتشار کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ موجودہ دور حکومت میں، جب "اسلامی نظام" اسلامی قوانین کا چرچا عام ہوا تو کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ شاید ہماری قسمت کے پلٹنے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ لیکن یہاں قرآنِ مجید کو بنیاد قرار دینے کے لئے بجائے فقہی مسائل کو قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کر دیا گیا ہے

مدّت کے بعد اذنِ تبسّم ملا ہمیں! وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

اب دیکھئے تمسّک بالکتاب کی جھلک کہاں سے نظر آتی ہے ؎

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کہاں سے مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

(٠)

بقیہ۔ شرک (از صفحہ) :- لغزشوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مقامِ بلند ہی کو کھو بیٹھے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی دنیا میں شرک سے بڑا جرم کوئی نہیں۔ اس سے انسان اپنے مقامِ بلند سے گر جاتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ انسان کو اس کے صحیح مقام تک پہنچا دینا ہے۔ اور یہ توحید کے سوا ممکن ہی نہیں۔ یعنی اس ایمان کے سوا کہ جھکنا صرف قوانینِ خداوندی کے سامنے ہے۔ کسی اور کے سامنے نہیں ——— یہ ہے صحیح مقامِ انسانیت! (۱۹۶۲ء)

سجدۂ شکرانہ :-

یہ پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۲۲ مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں، یہ ایمان افروز خبر وجہ فروغِ دیدہ ہوئی کہ

وفاقی شرعی عدالت نے رجم کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دے دیا

تفصیل اس کی یوں درج ہے :- ——— "اسلام آباد ۲۱ مارچ (پ پ ا) وفاقی شرعی عدالت نے آج کثرتِ رائے سے فیصلہ سنایا ہے کہ رجم یعنی سنگسار کر کے ہلاک کر دینا حد نہیں۔ یہ فیصلہ مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین احمد (چیئرمین) مسٹر جسٹس آغا حیدر علی، مسٹر جسٹس شیخ آفتاب حسین مسٹر جسٹس ذکاء اللہ لودھی اور مسٹر جسٹس کریم اللہ درانی (ارکان) نے درخواستوں پر سنایا ہے۔ یہ درخواستیں لاہور کے مسٹر حضور بخش، مسٹر ایم آئی چوہدری نے دائر کی تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ نفاذ حدود آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۹ء کے مطابق رجم یا سنگساری اسلامی احکام کے منافی ہیں۔ فاضل عدالت کے تین ججوں نے فیصلہ دیا کہ رجم حد نہیں۔ جبکہ جسٹس شیخ آفتاب حسین نے قرار دیا کہ یہ فیصلہ تعزیر کے تحت سزا کے مطابق ہے۔ تاہم مسٹر جسٹس کریم اللہ درانی نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ رجم حد ہے۔ عدالت کے اعلان کے مطابق اس فیصلے کا اطلاق اس سال ۳۱ جولائی سے ہوگا۔ اس وقت تک آئین کے تحت حکومت قانون میں ضروری ترمیم کرے گی۔ تاکہ اس قانون کو وفاقی شرعی عدالت کے اعلان کے مطابق بنایا جا سکے۔"

ہم سب سے پہلے بحضور رب العزت سجدہ ریز ہیں جس نے ہماری تیس سالہ کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ اس کے بعد ہم محترم حضور بخش اور ایم۔ آئی۔ چوہدری، نیز ان دیگر حضرات کو جنہوں نے اس باب میں کوشش فرمائی، مستحقِ مبارک باد سمجھتے ہیں۔ اور شرعی وفاقی عدالت کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس اولوالعزمانہ فیصلہ سے قرآنِ مجید کی برتری کو ثبت کر کے، اسلام کو دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

فجزاھم اللہ احسن الجزاء

حقائق و عبر

۱۔ قانون دان حضرات توجہ فرمائیں

ذیل کا مراسلہ گہری توجہ کا متقاضی ہے کیونکہ اس میں ایک اہم قانونی نکتہ اٹھایا گیا ہے۔

"دستورِ پاکستان (۱۹۷۳ء) کی شق ۲۲۷ میں کہا گیا ہے کہ تمام مروّجہ قوانین کو کتاب و سنت میں مذکور اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائیگا، اور کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو۔ سالِ گذشتہ اس شق میں جو ترمیم کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے:۔

جب مسلمانوں کے کسی فرقہ کے شخصی قانون پر اس شق کا اطلاق ہوگا تو کتاب و سنت کی اصطلاح سے مراد وہ مفہوم ہوگا جو وہ فرقہ اس اصطلاح سے لیتا ہے۔

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ شخصی قوانین کی فہرست کسی جگہ نہیں دی گئی۔ عام طور پر ان سے مراد، نکاح، طلاق، وراثت، وصیت وغیرہ سے متعلق قوانین لئے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی نصوصِ صریحہ کی رُو سے، فرقہ بندی شرک ہے، اس لئے میں کسی فرقہ سے متعلق نہیں۔ قرآنِ مجید میں جو احکام بصراحت دیئے گئے ہیں، میں اپنے آپ کو انہیں کا پابند سمجھتا ہوں (واضح رہے کہ میں فرقہ اہلِ قرآن سے بھی متعلق نہیں ہوں) اور شخصی قوانین کے متعلق اس میں بصراحت احکام موجود ہیں، اور انہی کو میں اپنی فقہ سمجھتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخصی معاملہ میں، میں قرآنِ مجید کے حکم کے مطابق عمل کروں تو کیا اسے مندرجہ بالا ترمیم کی رُو سے قانوناً صحیح سمجھا جائے گا؟ (مثلاً) وصیت کے متعلق مروّجہ فقہ کا قانون قرآنِ مجید کے صریحی حکم کے خلاف ہے۔ اگر میں قرآنِ مجید کے حکم کے مطابق وصیت کروں تو کیا اسے قانوناً صحیح سمجھا جائے گا؟ اس باب میں واضح راہ نمائی فرما دیں۔"

طلوعِ اسلام طلوعِ اسلام بھی فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے اور مروّجہ فقہ کا کوئی فیصلہ جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو، اسے خلافِ اسلام سمجھتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا ترمیم کا یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ حکومت ہر مسلمان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی فرقہ سے متعلق ہو کر شرک کا مرتکب ہو۔ احکام قرآنی تو بہر حال ہر فقہ سے بلند و بالا ہیں، اور اگر کوئی مسلمان شخصی قانون میں قرآنی احکام کے مطابق عمل کرتا ہے تو اسے قانوناً صحیح تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ لیکن چونکہ اس سوال کا تعلق مروّجہ قانون سے ہے، اس لئے ہم قانون دان حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ براہِ کرم اس باب میں ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ امید ہے کہ وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اسلام کی رُو سے یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ اس لئے اس میں ان کا تعاون نہ صرف ہمارے لئے باعثِ شکریہ ہوگا، بلکہ پوری اُمت کے نزدیک موجبِ تحسین۔ طلوعِ اسلام ان حضرات کے جواب کے لئے چشم براہ ہوگا۔

(۰)

۲۔ لاکھوں یتیموں کی دعائیں

ہماری فقہ کا یہ فیصلہ ہے کہ دادا کی وراثت سے ان یتیم پوتوں کو حصہ نہیں مل سکتا، جن کا باپ دادا کی زندگی میں وفات پا گیا ہو۔ فقہ کے متعدد دیگر فیصلوں کی طرح، یہ فیصلہ بھی قرآن کریم کے خلاف ہے۔ طلوعِ اسلام نے فقہ کے اس خلافِ قرآن فیصلہ کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ تاآنکہ عائلی قوانین میں اس کی جگہ قرآنی حکم کو قانون کا درجہ دے دیا گیا اور اس پر ہزارہا محروم الارث مظلوم یتیموں نے

سجدۂ شکرانہ ادا کیا لیکن ہمارے فرقہ پرست حضرات کے لئے یہ کیسے قابلِ برداشت ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس قانون کو منسوخ کرانے کے لئے مسلسل تگ و تاز جاری رکھی۔ انہیں عام حالات میں تو اس میں کامیابی نہ ہوئی لیکن جب صوبوں میں شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا تو پشاور کی شرعی بنچ میں ایک دعویٰ دائر کرا دیا گیا۔ مدعی کا تو اس میں ذاتی مفاد تھا، اس لئے اسے اپنے دعویٰ کی تائید کرنے والے بکثرت مل سکتے تھے۔ لیکن قرآن، یکہ و تنہا اور بے ساز و یراق تھا۔ اس لئے اس کی طرف سے مدافعت کرنے والا کہاں سے آتا؟ لیکن (بِلّٰہِ الحمد) کہ اس دور میں ایسے مردِ مسلمان موجود ہیں جو قرآنی دعویٰ کی وکالت کے لئے کسی صلہ کی امید یا ستائش کی تمنا کے بغیر کمر ہمت باندھ لیتے ہیں۔ اس مقدمہ میں قرآنی وکالت کی سعادت، بزمِ طلوعِ اسلام، ایبٹ آباد کے نمائندہ، محترم غلام مصطفیٰ اعوان ایڈووکیٹ، کے حصہ میں آئی اور انہوں نے بڑی محنت سے یہ مقدمہ لڑا، لیکن فیصلہ قرآن کے خلاف ہوا۔

اعوان صاحب نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور سپریم کورٹ کی شرعی اپیلٹ بنچ میں، پشاور بنچ کے فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ اس میں انہیں از سرِ نو تگ و تاز کرنی پڑی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مساعی کو مشکور فرمایا اور فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا، اور عائلی قوانین میں مخرج فیصلہ برقرار رہا۔

ہم، محترم اعوان صاحب کی خدمت میں، اپنی طرف سے ہی نہیں، لاکھوں یتیموں کی طرف سے، بلکہ ہر اس مسلمان کی طرف سے جو قرآنی احکام کی برتری کو جزوِ ایمان سمجھتا ہے، ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ صلہ اس کا انہیں بارگاہِ خداوندی سے یتیموں کی ان دعاؤں کی شکل میں ملے گا جو اپنا حق پا لینے کے بعد، ان کے قلب کی گہرائیوں سے اُبھریں گی۔

———(۰)———

۳۔ زکوٰۃ کا ڈیکلریشن

ہم نے، طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۸۰ء (صفحہ ۲۳) میں، ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا کہ جو حضرات، قرآنِ کریم کے احکام کی روشنی میں، اپنے آپ کو حکومت کے نافذ کردہ احکام کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلف نہیں سمجھتے، وہ اس قسم کا ڈیکلریشن گوشوارہ مجاز میں داخل کر دیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حضرات کی طرف سے کہا گیا ہے کہ

(۱) انہیں ڈیکلریشن کے مطلوبہ فارم نہیں ملتے۔ یہ کہاں سے لئے جائیں۔ اور

(۲) فارم کے فقہ کے خانے میں کیا لکھا جائے۔

جواب۔ (۱) اگر آپ کا حساب کسی ڈاک خانے، کسی بنک یا نیشنل سیونگز کی کسی شاخ میں ہے تو آپ کو یہ فارم وہیں سے مل جانے چاہئیں۔ اگر اس میں کچھ دقت ہو تو آپ ایڈمنسٹریٹر زکوٰۃ، وزارتِ مذہبی امور، فیڈرل گورنمنٹ آف پاکستان، اسلام آباد کو خط لکھ کر فارم منگوا لیں۔

(۲) فارم پر کرنے کی ہدایات خود فارم میں مذکور ہیں۔ جہاں تک فقہ کی صراحت کا تعلق ہے، فارم میں کہا گیا ہے:

میں مسلمان ہوں اور ———— فقہ کا پابند ہوں۔

آپ لکھئے کہ ——— میں مسلمان ہوں اور قرآنی فقہ کا پابند ہوں۔

اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس اعلان کے بعد آپ نہ صرف آئندہ ادائیگی زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار پا جائیں گے بلکہ جو زکوٰۃ پہلے کٹ چکی ہے، وہ بھی واپس مل جائے گی۔ ایک صاحب نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انہیں وضع کردہ زکوٰۃ کی رقم واپس مل گئی ہے۔ اگر کوئی ڈاک خانہ، بنک یا نیشنل سیونگز کی شاخ اس پر کسی قسم کا اعتراض کرے، تو آپ ان سے کہیئے کہ وہ اپنے حکام بالا سے اس پر فیصلہ لے لیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوں، تو آپ (مذکورہ بالا) ایڈمنسٹریٹر زکوٰۃ کو خط لکھیئے، اور ان کی طرف سے جو جواب موصول ہو اس سے ہمیں بھی مطلع فرمائیے۔

———(۰)———

باسمہ تعالیٰ

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۸۱ء

اسلامی نظامِ حکومت:

نہ مغربی جمہوریت، نہ شخصی حکومت

(پرویز صاحب کا ایک اہم بصیرت افروز مقالہ)

بتقریب یومِ پاکستان ۱۹۸۱ء

نہ مغربی جمہوریت — نہ شخصی حکومت

(قرآن کا فیصلہ)

پرویز

کاروانِ انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں۔ لرزہ انگیز خوں ریزیوں اور وحشت ناک فساد انگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس کے بعد وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے، جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اُسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گذر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گذر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے ——— معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ آج کی نشست میں ہم صرف اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہرحال، مِل جُل کر رہنا ہے۔ مِل جُل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصور پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس اندازِ زندگی میں قبیلہ کا بزرگ،

قبائلی زندگی

یعنی مورثِ اعلیٰ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجب الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا، اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS)

کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصوّر کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصوّر تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگ خاندان (یا تبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے، تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوا لیا) کہ درحقیقت حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ اس سے تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کے الوہیاتی اختیارات) کے نہج حکومت کی طرح پڑی۔

تھیاکریسی

کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شاہزور افراد ملا لئے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح حکومت بزورِ قوت" کا انداز وجود میں آیا۔ اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان اربابِ قوت (راجاؤں ... بادشاہوں) نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ خالی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت، بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پروہتوں) نے باہمی سمجھوتا کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دوائرِ اقتدار بانٹ لئے۔

ملوکیت

مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں، بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔

سیکولرازم

اس مختصر سی روئداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ انداز و اسالیبِ حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کارفرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختۂ مشق بنے، ان کے تصوّر سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیمیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکرین کے دل میں اس کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اندازِ حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ نظامِ حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مفکرین ہابز اور لاک سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی تفاصیل روسو (ROUSSEAU--1712-1778) نے مرتب کی تھیں اس لئے ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع

نظریۂ میثاق

کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن تمدنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کر دیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر فرد کے "دو ارادے" ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بہ حیثیتِ شہری ہونے کے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس "اجتماعی ارادے" کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسو نے کہا کہ اس کے لئے ہر فردِ معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت، افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے

ڈیماکریسی

نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق اسلوبِ حکومت کو ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ڈیماکریسی کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:۔

(۱) اس طرزِ حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

(۲) عوام کا منشاء ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہوسکتا ہے۔

(۳) کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریت رائے ہوتا ہے۔ اور

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آیۂ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطرافِ عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت۔ جمہوریت۔ جمہوریت کے نعروں سے کرۂ ارض گونج اٹھا۔ جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اس کی مخالفت کی اسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

(۰)

لیکن اس غلغلے اور طنطنے کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے تائید کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ مسلط ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے۔

جمہوریّت کے خلاف

اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریّت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF - CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، اندازِ جمہوریّت ہے۔ اس نے کہا تھا:-

اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا، عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور 'رعایا' افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔ (ص ۶۵)

اس نظریہ کے متعلق کہ اکثریت جسے صحیح کہدے، وہ صحیح ہوتا ہے، پروفیسر مذکور لکھتا ہے:-

عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا" ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (ص ۷۶)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:-

اقتدارِ اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصوّر ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں

آسکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ "اقتدارِ اعلیٰ سے مفہوم" اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلاحدود و قیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنابریں "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظرانداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور اس کے بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا یہ تصور صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص ۵۸)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کئے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C EWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL-THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح وبسط سے بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص ۱۱۶)

پروفیسر جوڈ (C.M JOAD) کو بھی، جو پہلے نظامِ جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ سائنس (یعنی مادی نقطۂ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رُو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:-

کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے:-

فریبِ جمہوریت

اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا

تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا مقتضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P. 106)

ڈین اِنگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف، مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:-

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں، مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام۔ (MIRABEAU)

ایک اور:-

جمہوریت نظری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔ (IRVING BABBIT)

اور خود اِنگے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک یہ نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بناتا ہے۔ (ص ۱۱۰)

۱۹۴۷ء میں، اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظام حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس کا نام ہے۔ (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کرے اور اسے بدلوا دے۔"

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین اور مدبرین کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے

کام لیا ہے جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" میں "سیاست" کا باب ملاحظہ فرمالیں۔

(۰)

اقتدارِ اعلیٰ

سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟ اس باب میں بنیادی اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکر (BERTAND DE JOUVENEL) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:-

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ، ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۹۹)

حکومت قانون کی

ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہر آئین ایڈورڈ کارون اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں قدرے وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICRO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:-

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے..... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صفحہ)

قانون کیسا ہو؟

مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:-

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت۔ آمریت)

یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابلِ تغیّر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا..... یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مستقم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (QUOTED BY GRIFFITH — IN — INTERPRETATERS OF MAN - PP 46-47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکّرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین و اصول تو بے شک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ وہائٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے) ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکّر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD - PP. 218-19)

آپ ان اقتباسات سے یونہی آگے نہ بڑھ جایئے۔ انہیں نگاہ میں رکھئے کیونکہ جب آگے چل کر قرآنی تجزیہ آپ کے سامنے آئے گا تو اس وقت ان کی اہمیت واضح ہو گی۔

ممتاز مغربی مفکّر (ERNEST BARKER) میزینی کی ہم نوائی میں کہتا ہے:-

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاشعاری کو عدمِ وفاشعاری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے، بادلِ نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (ص ۱۹۵)

مملکت کی اطاعت

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہرحال واجب

ہو۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کسی بلند تقاضے کے ساتھ نہ ٹکرائے۔ PRINCIPLES OF SOCIAL & POLITICAL THEORY — P.P. 193; 195; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکرین کے نزدیک حقِ حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرِفہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رُو سے اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابقِ عدل کہا جائے گا۔ لیکن اب یہ مفکرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کردہ ہے تو اس کی رُو سے فیصلہ مبنی بر عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدل کا مفہوم

(EMIL BRUNNER) ہمارے عہد کا، فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی مذہب پرست شخص کی زبان سے نہیں، عصرِ حاضر کے بلند ترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنیئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:-

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ،

سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر۔ نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:۔

وحی پر مبنی

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالم طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE & THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی مفکر اور مدبر، جمہوریت کے عواقب سے تنگ آ کر، اب کس قسم کے نظام کے لئے مضطرب و بے تاب ہیں۔ اس نظام کے لئے جس میں اطاعت کسی انسان کی نہ ہو۔ اطاعت صرف قوانین کی ہو! یہ قوانین کس قسم کے ہونے چاہئیں، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ لیکن چونکہ آگے بات انہی قوانین کے حوالے سے چلتی ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر دہرا دیا جائے۔

۱۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صحیح نظام حکومت وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کا اقتدار نہ ہو بلکہ قانون کی حکمرانی ہو۔

۲۔ یہ قانون ابدی، غیر متبدل، زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، عالم گیر ہو۔

۳۔ کسی حکومت کو اس کا اختیار نہ ہو کہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف، اس میں ترمیم بھی کر سکے۔

۴۔ یہ قانون خدا کا متعین کردہ ہو اور وحی کے ذریعے انسانوں کو ملا ہو۔

۵۔ اس کے اصول و حدود تو غیر متبدل ہوں لیکن اس کے نفاذ کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں۔

یہ ہے وہ نظام جس کا عکس یہ مفکر (سویڈن کے مشہور ماہر اقتصادیات۔ مرڈل کے الفاظ میں) "اپنی روح کے نشیمن میں دیکھ رہے ہیں"۔ اور جسے لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے ان کی نگاہیں بے تاب ہیں۔

(۰)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مفکر (کم و بیش سب کے سب) عیسائی ہیں اور وحی کے قائل۔ تو پھر انہیں انتظار اور تلاش کس بات کی ہے۔ یہ سیکولر ڈیماکریسی کی جگہ عیسائیت کا نظام کیوں نہیں رائج کر لیتے؟ اور اس کا جواب ایک فقرے میں یہ ہے کہ یہ عیسائیت کا نظام ہی تو تھا جس سے تنگ آ کر انہوں نے سیکولر نظام رائج کیا تھا۔ عیسائیت (کلیسا) کی تھیاکریسی نے انسانیت پر جس قدر لرزہ انگیز اور وحشت ناک مظالم ڈھائے تھے، ان سے بچنے کے لئے انہوں نے سیکولرازم کی پناہ تراشی تھی۔ اس لئے وہ عیسائیت کی طرف تو قیامت تک رخ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی انہیں معلوم ہے کہ موجودہ عیسائیت (بائیبل، خواہ وہ عیسائیوں کی انجیل

ہو اور خواہ یہودیوں کی تورات) مبنی بر وحی نہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ اس مقالہ میں میرا موضوع مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں۔ لیکن عیسائیت کے متعلق ان مفکرین کی کیا رائے ہے، اس کی ایک جھلک دیکھ لینا غیر محل نہ ہوگا۔

عیسائیت کی ناکامی

پروفیسر جوڈ، لکھتا ہے:-

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اُخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس، یہ دنیا شرّ و فساد کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے، یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے خیر اور طیّب نہیں۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS & POLITICS - P. 127)

ہسپانوی پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) اس باب میں کہتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی ذہانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے باہر کی چیز ہے..... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(QUOTED BY BRIFAULT - IN - THE MAKING OF HUMANITY - P 334)

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی رائے ہیں:-

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے، اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے، تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURE OF IDEAS - P. 18)

انہی حقائق کے پیشِ نظر، تہذیب کا مشہور امریکی مؤرخ، ڈورسی، اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے:-

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے، وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اعتماد نہیں۔ "اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔" یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۶)

(۶)

اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جائے، یا جس زندگی بخش نظام کی اسے تلاش ہے وہ کہیں سے مل سکتا ہے؟ وہ مل سکتا ہے اور ان پیمانوں پر پورا اترتا ہے (بلکہ ان سے بھی آگے جاتا ہے) جو ایسے نظام کے لئے ان مفکرین کے تصورات میں انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ میں نے اس نظام کے سلسلہ میں ان مفکرین کی کتابوں کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اب میں ان کے لئے ایک ایسی کتاب کے

قرآنی نظام

اقتباسات پیش کروں گا جس میں یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس کتاب کے متعلق خود مغرب کے اکثر محققین کا اعتراف ہے کہ وہ مبنی بر وحی ہے اور یکسر غیر محرف۔ اسے قرآن مجید کہا جاتا

ہے جو ہماری زندگی کے دائرے کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان مفکرین کے نزدیک بنیادی طور پر صحیح نظام وہ ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا انسانوں کا گروہ) محکوم نہ ہو۔ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ۔ (آیت کا باقی حصہ بعد میں آئے گا۔ ۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اس کے پاس ضابطہ، قوانین ہو یا اقتدارِ حکمرانی حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو ـــــ کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے کس طرح چند الفاظ میں اس بنیادی مسئلہ کو حل کر دیا جس میں نوعِ انسان صدیوں سے مضطر کی طرح سرگرداں چلی آ رہی تھی۔ اس آیت میں، مقننہ اور انتظامیہ کے علاوہ نبی تک کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ اسے بھی حقِ حکومت حاصل نہیں!

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اصول یا قانون دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت اور حکمت کیا ہے۔ جب یہ کہا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں، تو اس کی وجہ یہ بتائی کہ

شرف و تکریمِ انسانیت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجبُ التکریم پیدا کیا ہے"۔ اور تکریم و شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے نزدیک، انسانوں کی حکومت، شرف و تکریمِ انسانیت کے منافی ہے۔ ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز ماہر (ERICH FROMM) کہتا ہے کہ

ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے۔ جس میں اسے (DEHUMANISE) کر دیا جائے، آزادی نہیں رہتی۔ غلامی بن جاتی ہے۔

(THE REVOLUTION OF HOPE - P. 91.)

شرف و تکریمِ انسانیت یا احترامِ آدمیت تو خدا کا عطا کردہ ہے۔ قرآن کی رُو سے مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ، نہ صرف اس شرف و تکریم کی حفاظت کرے، بلکہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں شرف و تکریم کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور بڑھتی، پھولتی، پھلتی چلی جائیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت، جس سے اس کتابِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے، ربوبیتِ عالمین قرار دی ہے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱/۱) ظاہر ہے کہ وہی نظام منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا ہوگا جو خدا کی اس صفت کا مظہر ہو۔ ایرک فرام دوسرے مقام پر لکھتا ہے:-

زندگی کا تقاضا زندہ رہنا اور بڑھنا پھلنا پھولنا ہے۔ اگر اس کے اس تقاضے کے راستے میں

رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس مسدود توانائی میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو نشوونما دینے کے بجائے اسے تباہ کر دینے کا موجب بن جاتی ہے۔ یاد رکھئے، تخریب یا تباہی (UNLIVED LIFE) ؎ کا فطری نتیجہ ہے۔ وہ افراد یا معاشرتی حالات جو زندگی کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں تخریب پیدا کرتے ہیں۔ اور تخریب وہ سرچشمہ ہے جس سے شر کے مختلف مظاہر پھوٹتے ہیں۔ (MAN FOR HIMSELF - P. 218)

(BARKER) جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کہتا ہے:۔

وہی معاشرہ عدل کا علمبردار کہلا سکتا ہے جس کا مقصود یہ ہو کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذات کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے (P. 123)

انسانوں کی حکمرانی میں، محکوموں کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے (انسانی حکومت قائم ہی خوف کے زور پر رہتی ہے) اور خوف، انسانی ذات کے تباہ اور اسے شرفِ تکریم سے محروم کر دینے کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

خوف و حزن

اسلام، نظامِ فطرت میں مکمب و اذیت، گناہ اور کش مکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلہ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف و حزن سے آزاد ہو جائے ..... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات، لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے ..... پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS & REFLECTIONS - P.P. 34-37)

؎ ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی غزل کا ایک شعر ہے جس کا تعلق تو روحانی جذبات سے ہے لیکن اس میں 'عمر' اور 'زندگی' میں جو فرق کیا گیا ہے اس سے (UNLIVED LIFE) کے مفہوم کی خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے، اگرچہ ایرک فرام نے یہ الفاظ جس مفہوم کے لئے استعمال کئے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ وہ شعر ہے ؎

جی لیا چار دن جوانی میں! زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

یعنی جس عمر میں 'زندگی' نہیں ہوگی وہ (UNLIVED LIFE) ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے جہنم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۲۰/۷۴) اس میں نہ زندگی ہوگی نہ موت۔ یہ وہ اندازِ زیست ہے، جسے (UNLIVED LIFE) کہا جائے گا۔

اسی حقیقت کو وہ "مثنوی رموزِ بیخودی" میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست　　　اصلِ او بیم است، اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ　　　این ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا، پیراہنش　　　فتنہ را آغوشِ مادر دامنش

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است!
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(صفحہ ۱۱۰ — ۱۱۱)

"شرک" انسانوں کی حکمرانی کا نام ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے، خدا کی متعین کردہ حدود پر قائم شدہ نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) "اس میں کسی کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔"

سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے انسانوں کی حکومت کو مردود قرار دے دیا، تو اس سے کیا یہ مراد ہے کہ وہ انسانی دنیا کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بات یہ نہیں۔ وہ حکومت کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن "خدا کی حکومت" کو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "یاد رکھو! حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔" وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶)۔

خدا کی حکومت

لیکن خدا تو غیر مرئی اور غیر محسوس ہستی ہے —— غیر مرئی اور غیر محسوس تو ایک طرف، اس کی ذات تو کسی کے تصور تک میں نہیں آسکتی۔ تو پھر اس کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری حکومت سے مراد، اس کتاب کی حکمرانی ہے جسے ہم نے وحی کے ذریعہ نازل کیا ہے۔ اس نے جملہ انبیاء کرامؑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:-

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)

خدا نے ان انبیاء کے ساتھ الکتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔

قانونِ خداوندی کی حکمرانی

شخصیت کے بجائے، قانون کی حکمرانی کا تصور، انسان کو کن بلندیوں پر لے جاتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! اور پھر قانون بھی وہ جو کسی انسان کا وضع کردہ نہ ہو۔ اسلام میں بلند ترین اور عظیم ترین شخصیت حضور نبی اکرمؐ کی ہے۔ خدا نے حضورؐ کو بھی یہ حکم دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) "اے رسول! تم لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔" سربراہِ مملکت، بلکہ یوں کہیئے کہ رسول اللہؐ بھی اسی کتاب کا اتباع کرتے تھے۔ (۶/۵۰، ۱۰/۱۵، ۴۶/۹) اور اس کی خلاف ورزی کو خود اپنے لئے بھی مستوجبِ سزا قرار دیتے تھے (۱۵/۱۰) حقِ مطلق۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) بھی اسی کتاب کو حاصل تھا۔ مملکت یا سربراہِ مملکت کو نہیں۔ (SOVEREIGN) کی تعریف یہ

کی جاتی ہے۔

(ACCOUNTABILITY TO NONE.)

جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہ ہو، کوئی اس سے باز پُرس نہ کر سکے۔ قرآن مجید نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳)

صرف خدا کی ذات ایسی ہے جو کسی کے سامنے جواب دِہ نہیں۔ باقی سب جواب دِہ ہیں۔ اس سے کتاب اللہ کی حکمرانی کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔

اس کتاب میں دیئے گئے احکام و اصول و اقدار کے متعلق کہا کہ

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کے کلمات (احکام و قوانین) صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

حتیٰ کہ رسول اللہ بھی نہیں۔ فرمایا:۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ..... (۱۰/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے بھی اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کتاب میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں۔

اس کتاب کا اطلاق تمام قوموں پر، اور تمام زمانوں میں ہوگا۔ اس لئے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوام عالم کے لئے ضابطۂ ہدایت۔

ان تصریحات کے بعد آیئے اس آیۂ جلیلہ کی طرف جو اس نظام خداوندی کی عروۃ الوثقیٰ ہے اور جس کا تھوڑا سا حصہ پہلے پیش کیا گیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ
تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اسے ضابطۂ قوانین، یا اقتدار حکومت، اور نبوت تک بھی کیوں نہ حاصل ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کی نہیں، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب، اس کتاب کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو، اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معانی کی تہ تک پہنچتے ہو، ربّانی بن جاؤ، یعنی خدا کے محکوم۔

اس آیت نے انسانوں کے حق حکومت پر یک قلم خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ جب اس نظام میں نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے، تو مذہبی پیشواؤں کو اس کا حق کیسے حاصل ہو جائے گا۔ ان کا تو اس نظام میں وجود تک نہیں ہوگا۔ ان کے متعلق

تھیاکریسی کا خاتمہ

قرآن کہتا ہے کہ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۹/۳۴) "وہ لوگوں کی محنت کی کمائی ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ اس طرح قرآن نے تھیاکریسی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

اور یہی ہے وہ کتاب جسے اس نے غلط اور صحیح نظام میں حدِ امتیاز قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اسلام، قرآن مجید کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا نام ہے۔ جو نظامِ حکومت اس کے مطابق نہیں، وہ کافرانہ نظام ہے۔

ہم پوچھتے ہیں مغربی مفکرین اور مدبرین سے کہ جس قسم کے نظام کی آپ کو تلاش ہے، کیا وہ اس کتابِ عظیم کے اندر نہیں ملتا؟ صحیح نظامِ انسانیت کے لئے جو پیمانے آپ نے مقرر کئے ہیں، کیا یہ ان پیمانوں پر پورا نہیں اترتا؟ اس نظام کو (کسی پر زبردستی ٹھونسنا تو ایک طرف۔ کیونکہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا) ہم از خود آپ کے سامنے پیش بھی نہیں کر رہے۔ آپ اس کے متلاشی تھے۔ ہم نے صرف اس کا پتہ نشان بتا دیا ہے۔ آپ اس پر خود غور کر لیں۔ اگر یہ فی الواقعہ آپ کے ..... پیش کردہ پیمانوں پر پورا اترے تو پھر اس کے اختیار کرنے میں تو آپ کو کسی قسم کا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے اقوامِ عالم اس جہنم سے نجات حاصل کر لے گی جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اسے اس وقت قبول اور اختیار نہ بھی کیا تو اس سے اس کی ناکامی لازم نہیں آئے گی۔ نوعِ انسان نے بالآخر اس کی طرف آنا ہے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ... (۹/۳۳) اس نے آخر الامر ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے۔ نوعِ انسان اسے جتنی جلدی اختیار کر لے گی، مزید تباہیوں سے بچ جائے گی۔

(۰)

ثبات و تغیّر کا امتزاج

اب آیئے اس نظام کے اس گوشے کی طرف جس کے متعلق وہائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اسے ثبات اور تغیّر کا امتزاج ہونا چاہیئے۔ یعنی اپنی جگہ غیر متبدّل بھی اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے والا بھی۔

قرآنِ مجید کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں تھوڑے سے متعیّن احکام ہیں اور زندگی کے دیگر امور کے متعلق اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں اور اسے قرآنی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے طور طریقے، اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے۔ اس کے اصول اور اقدار تو ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کی تعمیل کیلئے طور طریقے (جنہیں آپ جزئی قوانین' یا "بائی لاز" کہہ لیجئے) حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ ثبات (غیر متبدّل) اور تغیّر (بدلنے والی جزئیات) کے

امتزاج سے یہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا جائے گا۔ جس نظام کو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہمیشہ تک نافذ العمل رہنا ہوا اُسے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ یہ جزئی قوانین باہمی مشاورت سے وضع کئے جائیں گے۔ خود حضور نبی اکرمؐ سے ارشادِ خداوندی ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) امورِ مملکت میں ان (اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ اور اس طرح حضورؐ کے بعد، ملّتِ اسلامیہ سے متعلق کہا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔

مشاورت

ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے احکام، اصول و اقدار (کلمات اللہ) غیر متبدّل ہیں۔ لہٰذا ان میں، اُمّت تو ایک طرف، خود نبی اکرمؐ بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔ جن کلمات اللہ میں، کسی تبدیلی کی گنجائش یا امکان نہ ہو، ان میں کسی قسم کے مشورہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مشاورت، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے نظم و نسق کے بارے میں ہو گی۔ اس لئے اس کے لئے "امر" کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ مشاورت امورِ مملکت میں ہو گی۔ پھر اس مشاورت کا حکم بھی اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ مشاورت کی مشینری اللہ تعالیٰ نے خود وضع اور متعیّن نہیں کی۔ ہر زمانے کی قرآنی مملکت جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے، اختیار کر سکے گی۔ تجربہ کے بعد، یا مرورِ زمانہ سے اس مشینری میں ردّوبدل ہو سکے گا لیکن وہ حدود اپنی جگہ غیر متبدّل رہیں گے جن کے اندر رہتے ہوئے یہ مشاورت عمل میں آئے گی۔ یعنی اس مشاورت سے بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جا سکے گا جو کسی طرح بھی قرآنِ مجید کے احکام و اصول سے ٹکرائے۔ قرآنی مملکت کا اتنا ہی اختیار ہو گا۔ یعنی اس کا فریضہ قرآنی احکام و اصول کا نفاذ ہو گا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے طور طریق وضع کرنا، اس کے اختیارات کی حد۔ آپ اس کا مقابلہ مغربی جمہوریت سے کیجئے۔ اسلامی اور کافرانہ نظام نکھر کر سامنے آجائے گا۔ مغربی نظامِ جمہوریت ان بنیادوں پر قائم ہے کہ

جمہوریّت اور مشاورت

(۱) اقتدارِ اعلیٰ یا اختیارِ مطلق، قوم یا عوام کو حاصل ہے۔

(۲) قوم اس اختیار کو اپنے منتخب نمائندگان کو تفویض کر دیتی ہے۔

(۳) یہ نمائندگان یا ان کی اکثریت جس قسم کے قوانین چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ ان کے قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں۔ کوئی حدود و قیود نہیں۔ انہیں اس کا حقِ مطلق حاصل ہے ——— قانون سازی کا یہی وہ حقِ مطلق ہے جس کے خلاف مغربی مفکّرین صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

اس کے برعکس، قرآنی مشاورت میں قانون سازی کا حقِ مطلق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مشاورت یا جزئی قانون سازی، قرآن کی غیر متبدّل حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جا سکتی ہے۔ اس مملکت کی دستور اور قوانین ساز "اسمبلی" کوئی ایسا قانون نہیں مرتب کر سکتی جو قرآنی حدود سے ٹکرائے۔ مغربی مفکّرین اسی قسم کے نظام کی تلاش میں ہیں۔

اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلامی نظام کا نقشہ یہی تھا۔ اس میں مشاورت کی مشینری کس قسم کی تھی اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابلِ اعتماد نہیں۔ اس میں ہر قسم کے متضاد واقعات اور کوائف مل جاتے ہیں۔ اس میں ویٹو کی رُو سے فیصلوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی اور کثرتِ رائے کی رو سے فیصلوں کی مثالیں بھی۔ اس باب میں میرا مسلک یہ ہے کہ اس میں جو واقعات ایسے ہوں جو قرآنِ کریم کی تعلیم اور پیغام کے مطابق ہوں، یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہوں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مسلک کے مطابق، اس دور کے اندازِ مشاورت کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ جو ہمارے نزدیک منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ حجاز میں رقباتِ اراضی چنداں بڑے نہیں تھے اس لئے ان کے نظم و نسق کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو وہاں بڑی وسیع و عریض اور نہایت زرخیز و شاداب اراضیات

صدرِ اوّل میں مشاورت

مملکت کی تحویل میں آئیں۔ اس وقت اس سوال نے پہلی مرتبہ ایسی اہمیت حاصل کی کہ یہ معاملہ مجلسِ مشاورت میں بحث کا موضوع بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے معاملہ زیرِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رائے میں ان اراضیات کو افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے اور اس کا نظم و نسق علیٰ حالہٖ قائم رہنے دینا چاہیئے۔ بعض صحابہؓ نے اس تجویز کی مخالفت میں تقاریر کیں۔ معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس بحث کو دوسری نشست پر اٹھا رکھا جس میں انصار کے قبیلہ اوس و خزرج کے عمائد کو بھی دعوت دی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ بڑی غور طلب ہے۔ آپؓ نے کہا:۔

> میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کسی نے میری مخالفت کی ہے۔ نہ اس پر فخر کہ کسی نے میری موافقت کی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں۔ اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (اور حق کا معیار اللہ کی کتاب ہے) یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے اپنے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔ (شاہکارِ رسالت - صـ۳۸۵ـ)

آپ نے غور فرمایا کہ باہمی مشاورت کا مقصد کیا تھا؟ یہ مقصد کہ خدا کی کتاب پر غور و خوض کے بعد یہ طے کیا

جائے کہ اس باب میں اس کا منشا کیا ہے۔ اس نشست میں بھی معاملہ طے نہ ہوا تو آپ نے تین دن کی مزید مہلت چاہی تاکہ قرآن مجید پر زیادہ تعمق سے غور کر لیا جائے۔ تین دن کے بعد آپ نے مجلس سے کہا کہ میں نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس میں سے راہ نمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ حشر کی آیات تلاوت فرمائیں اور کہا کہ ان میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۔ (۵۹/۱۰)

ان میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئیں گے۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس قرآنی استدلال کو سُن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اُٹھے اور مخالفین اور موافقین سب جوشِ مسرت سے پکار اُٹھے کہ "آپ کی تجویز بالکل درست ہے۔ ہم سب آپ سے متفق ہیں"۔

یہ تھا اندازِ مشاورت اسلام کے صدرِ اوّل میں۔ یعنی اس میں تحقیق یہ کیا جانا مقصود ہوتا تھا کہ معاملہ زیرِ نظر کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد یا منشا کیا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس مشاورت اور مغربی جمہوریت میں کس طرح "بُعد المشرقین" ہے! وہ حضرات اپنی رائے اور وحی میں کس قدر فرق ملحوظ رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپؓ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے بہت بری بات کی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمّت کے لئے سنت نہ بناؤ"۔

ان آخری الفاظ میں اسلام میں قانون سازی کے اصول پر بڑی نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر (بالفرضِ محال) ہمیں حتمی طور پر معلوم بھی ہو جائے کہ اُس زمانے میں کسی معاملہ کو کس طریق سے طے کیا گیا تھا، تو وہ طریقہ ابدی طور پر غیر متبدل دین نہیں قرار پا سکتا۔ وہ طریق اُس زمانے کے حالات کے مطابق، انہی کے لئے تھا۔ بعد کی اسلامی مملکت اپنے حالات کے مطابق اپنے لئے خود طریق وضع کر سکتی ہے۔ جو بات اس زمانے میں (یا کسی بعد کے زمانے میں) باہمی مشاورت سے طے پائی تھی وہ بہرحال انسانوں کی رائے تھی۔ اور (جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا) انسانی رائے ابدی طور پر دین نہیں بن سکتی۔

(۰)

ہم اور جمہوریت

یہ تھا قرآن کریم کی رو سے، اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت۔ اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کا نظامِ جمہوریت اور اسلامی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن غلامانہ ذہنیت بڑی پختہ اور غیر شعوری طور پر دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہے۔ غلام قوموں کو طبیعی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی ان کی ذہنیت غلامانہ ہی رہتی ہے اور اسے بدلنے میں بڑا وقت بھی لگتا ہے اور سخت محنت بھی درکار ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت کی حمد و ستائش کے قصیدے ہمارے دورِ غلامی میں ہمارے کانوں میں پڑتے۔ انگریز یہاں سے چلا بھی گیا لیکن یہ قصائد ابھی تک ہمارے دل کی گہرائیوں میں تہ نشین ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں "جمہوریت" کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۷ء میں تبدیلیٔ حکومت کے لئے جو تحریک اُٹھی تھی اسے "بحالیٔ جمہوریت" کی اسلامی تحریک کہا جاتا تھا۔ اس تحریک کا مقصد شخصی حکومت کی جگہ قومی حکومت قائم کرنا تھا اور چونکہ قومی حکومت کے لئے مغرب میں جمہوریت کی اصطلاح رائج ہے اس لئے انہوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شخصی حکومت کے مقابلہ میں قومی حکومت قابلِ ترجیح ہوتی ہے لیکن ان میں سے ایک کو غیر اسلامی اور دوسری کو اسلامی کہنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ شخصی حکومت اور مغربی انداز

کی جمہوری حکومت دونوں خلافِ اسلام ہیں۔ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو۔ اور کتاب اللہ کی حکمرانی اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں۔ لہٰذا، ان ممالک میں جہاں جمہوریت کا ذکر کیا جائے گا اس سے مراد شخصی حکومت کے برعکس، مغربی جمہوریت کے انداز کی حکومت ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، سیکولرازم (خلافِ اسلام نظام) کے نقطۂ نگاہ سے تو اس بحث کی گنجائش ہے کہ شخصی نظامِ حکومت اچھا ہے یا جمہوری انداز۔ لیکن قرآنی زاویۂ نگاہ سے اس بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے اس بحث کو بڑی عمدگی سے یہ کہہ کر نپٹا دیا کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور دین سے ان کی مراد قرآن ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

---

(۰)

چونکہ پاکستان اسلام کے نام سے حاصل کیا گیا تھا، اس لئے ہمارے ہاں یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ کوئی بات کی جائے اس کے ساتھ لفظ اسلام کا تکملہ ضرور لگا لیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے جب یہاں معاشی نظام کی بات چلی تھی تو سوشلزم کے حامیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ نظام اسلام کے خلاف ہے۔ انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ ہم یہاں سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سوشلزم کے ساتھ لفظ اسلامی کے الحاق سے لادینی سوشلزم عین اسلامی ہو گئی۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی میں کچھ ہنگامے ہوئے جن میں تخریب پسندوں نے لوٹ مچائی۔ عمارات پر پتھراؤ کیا۔ دکانوں کو جلایا۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں۔ وہاں ایک بند دکان کے کواڑ کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا "یہ شراب کی اسلامی دکان ہے۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے"۔ ہمارے ہاں اس طرح ہر غیر اسلامی بات اسلامی ہو جاتی ہے۔ یہی صورت اسلامی جمہوریت کی ہے۔ واضح رہے کہ جب کوئی لفظ بطور اصطلاح کے رائج ہو جائے تو اس کے لغوی معانی نہیں بلکہ اصطلاحی معانی لئے جاتے ہیں۔ سوشلزم کی طرح جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد مغرب کا سیکولر جمہوری نظام ہے۔ اس اعتبار سے "جمہوریت" اور "اسلامی" دو متضاد عناصر ہیں جو آپس میں مل نہیں سکتے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس اصطلاح کو ہمارے ہاں شخصی نظامِ حکومت سے متمیز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے خالی "جمہوریت" یا "جمہوری نظام" کہئے۔ "اسلامی" کا لاحقہ تو اس کے ساتھ نہ لگائیے۔ اس (پاکستانی) نظام کے اسلامی ہونے کی شرط پہلے بیان ہو چکی ہے۔ یعنی اگر اس نظام میں کتاب اللہ کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، حکمرانی اس کی ہے۔ تو وہ اسلامی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ اسلامی نہیں خواہ وہ شخصی ہو اور خواہ جمہوری۔ (کئی اور مملکتوں کی طرح) ہمارے آئین میں بھی پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کہا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول کے مطابق یہ مملکت ابھی تک اسلامی نہیں بنی، اس میں جب کبھی جمہوری نظام رائج ہوا ہے اس کی جزئیات تک بھی مغربی جمہوریت سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس میں اس پر تو بحث ہوتی ہے کہ سسٹم پارلیمانی ہونا چاہیئے یا صدارتی۔ یہ سوال کبھی زیرِ بحث نہیں آتا کہ اسے "اسلامی" کس طرح بنایا جائے۔ گویا اس طرف سے قوم بالکل مطمئن ہے کہ چونکہ اس کا نام اسلامی جمہوریہ ہے اس لئے یہ مملکت اسلامی ہے۔

الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا ہے اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ تھیاکریسی (THEOCRACY) کے لغوی معنی ہیں "خدا کی حکومت"۔ لیکن اصطلاح میں یہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت کو کہا جاتا ہے جس میں ہر غیر خدائی حربہ خدا

کے نام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈیماکریسی (DEMOCRACY) کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی یکساں ہیں۔ یعنی عوام کی حکومت۔ یہ لغوی اور اصطلاحی ہر دو لحاظ سے اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں ایک آواز اٹھی تھی کہ "اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ تو مذہبی حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا تھا۔ ان کے نزدیک یہ آواز تو خلافِ اسلام تھی لیکن جمہوریت عین مطابق اسلام تھی۔ یعنی انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں یا حقِ حکومت عوام کو حاصل ہے۔

بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے جمہوریت کی مخالفت ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک یہ نظام قرآن کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ صدرِ اوّل کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت مسلط ہو گئی جو آج تک چلی آ رہی ہے۔ ملوکیت کے خلافِ قرآن ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ قرآن تو اس کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ بقول اقبالؒ :-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم! کہ در دینش ملوکیت حرام است (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۲)

ہمارے ہاں کی تاریخ۔ روایات۔ فقہ، سب دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئے۔ انہی کے مجموعے کا نام (مروّجہ) اسلام ہے۔ ان کے مرتب کرنے والے بڑے واجب الاحترام مقتدا ہیں۔ لیکن (جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے) ہمیں کہیں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ان میں سے کسی نے ان بادشاہوں سے کہا ہو کہ تمہاری حکومت اصلاً خلافِ اسلام ہے۔ عقائد اور مسالک کے اختلاف کی بنا پر ان بزرگوں میں سے بعض نے ان سلاطین کے ہاتھوں صعوبات بھی برداشت کیں، لیکن اصل و بنیادِ ملوکیت کو خلافِ اسلام قرار دینے کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی۔

اس کے برعکس محراب و منبر سے ان کے حق میں تعریف و تحسین کے کلمات اور خطبوں میں ان کی مملکت کے استحکام و فروغ کی دعاؤں کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ اب اگر ہمارے مذہبی پیشوا شخصی حکومت کی مخالفت کریں تو ان سے پہلا سوال یہ پوچھا جائے گا کہ پھر آپ ان اسلاف کے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے ملوکیت کے خلافِ اسلام ہونے کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس کے برعکس الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے زمانے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے: اتوہ اربعین شیخاً وشھدوا لہ ان الخلفاء لاحساب علیھم ولاعذاب۔ "چالیس شیوخ نے آ کر اس امر کی گواہی دی کہ خلفاء قیامت کے دن بلا حساب بخشے جائیں گے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ (تاریخ الیافعی صفحہ ۲۴۳۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۸۰ء صفحہ ۴۲)۔ فقہ حنفی کے مشہور امام جصاصؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "محدثین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کا خیال تھا کہ ظلم و جور اور بیگناہوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہوں کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے۔ اور وہ بھی حرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہرحال کسی کے خلاف اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔ (احکام القرآن جلد دوم صفحہ ۳۲۔ بحوالہ ایضاً)۔ فقہ حنفی البتہ اس باب میں اتنی سی رعایت برتتی ہے کہ

کل شئی صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحدّ علیہ الاالقصاص (ہدایہ اوّلین۔ مجیدی صفحہ ۴۹۳)

ایسا امیر جس کے اوپر کوئی دوسرا امیر نہ ہو، قتل کے سوا کوئی جرم بھی کرے، تو اس پر حد نہیں۔

جن حضرات کے عقائد اس قسم کے ہوں وہ شخصی حکومت کو کس طرح خلافِ اسلام قرار دے دیں گے؛ یوں بھی مذہبی پیشوائیت پنپتی ہی شخصی حکومت میں ہے۔ وہ انہیں فقہی قوانین کی ترویج کی اجازت دے دیتے ہیں اور یہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام کا منشا پورا ہو گیا خواہ اسلوبِ حکومت کسی قسم کا ہو۔

؎ان حقائق کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب "حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" صفحہ ۲۵۔ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

طلوع ... سیاسی ...

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ جمہوریت کو مطابق اسلام قرار دیدیتے ہیں نہ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور نہ ہی وہ جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت نہ کسی ایک شخص کی ملکیت ہو سکتی ہے، نہ کسی گروہ کی۔ وہ پوری کی پوری اُمت کو عطا ہوتی ہے۔ آیۂ استخلاف میں ہے، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ..... (۲۴/۵۵) "جو لوگ تم میں سے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر کاربند ہوں گے ان سے خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں ملک میں حکومت عطا کرے گا"۔ سورۂ حج میں انہی مومنین کے متعلق ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو......" اس سے واضح ہے کہ مملکت اور حکومت پوری کی پوری اُمت کو عطا ہوتی ہے۔ یہ رہی ایک بات۔ اور دوسری بات یہ کہ مملکت یا حکومت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ آیۂ استخلاف میں ہے: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) یہ اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ دینِ خداوندی کو متمکن کریں۔ اور سورۂ حج میں کہا گیا ہے کہ یہ اقتدار اس لئے دیا جاتا ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۲۲/۴۱) وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر، مملکت کا نظم و نسق پوری اُمت کا فریضہ ہوگا جسے وہ باہمی مشاورت سے سرانجام دیں گے لیکن اس کا مقصد دین کا تمکن ہوگا، جو کتاب اللہ کی حکمرانی سے حاصل ہو سکے گا۔

(۷)

چونکہ یہ موضوع ذرا پیچیدہ سا ہے اور بحث قدرے طویل ہو گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ملخص چند الفاظ میں بیان کر دیا جائے:۔

(۱) دانشورانِ مغرب نے شخصی حکومتوں اور تھیاکریسی سے تنگ آ کر ایک نئے نظامِ حکومت کی طرح ڈالی جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) اس نظام کی رو سے انہوں نے کہا کہ (i) اقتدارِ اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ (ii) قوم اپنے اس اقتدار کو اپنے منتخب نمائندوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ اور (iii) یہ نمائندے بالاتفاق یا کثرتِ رائے سے جس قسم کا قانون چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ انہیں قانون سازی کا حقِ مطلق حاصل ہوتا ہے اور ان قوانین کی اطاعت تمام قوم پر لازم۔

(۳) مفکرینِ مغرب نے سمجھا تھا کہ اس سے وہ انسانوں کی حکومت سے نجات حاصل کر لیں گے لیکن تھوڑے سے عرصہ کے تجربہ نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ نظام شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ مستبد اور انسانیت کش ہے۔

(۴) اس بنا پر اب وہ، کسی اور نظام کی تلاش میں ہیں۔ اس نظام کا ان کے ذہن میں تصور یہ ہے کہ

(ا) اس میں حکمران انسانوں کے بجائے خدا کی ہونی چاہیئے۔

(ب) اس سے مراد تھیاکریسی نہیں، بلکہ خدا کے عطا کردہ ابدی، غیر متبدل، عالمگیر قوانین ہیں جن کا اطلاق تمام اقوامِ عالم پر ہر زمانے میں یکساں ہو سکے۔

(ج) یہ قوانین تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائینگے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کی مشینری کی ضرورت پڑے گی۔

(د) یہ قوانین، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی مل سکتے ہیں۔

(۵) اس نظام کے بنیادی اصول تو انہوں نے ذہن میں قائم کر لئے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا ... کہ یہ قوانین انہیں ملیں گے کہاں سے؟ وہ (کم و بیش) سب کے سب عیسائیت کے پیرو ہیں لیکن انہوں نے عیسائیت کو اس مقصد کے لئے بالکل ناکام پایا۔

ظاہر ہے کہ ان کے معیار کے مطابق قوانین قرآنِ کریم میں مل سکیں گے لیکن ان کی نگاہ اس طرف سے اس لئے نہیں اٹھ رہی کہ ان کے نزدیک اس قرآن کی حامل قوم مسلمانوں کی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پست اور کمزور ہے۔ اور ان کے ہاں یا تو شخصی حکومتیں قائم ہیں یا اس جمہوری انداز کی جسے وہ عملی تجربہ کے بعد مردود قرار دے چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اور قرآن کے درمیان یہ حائل ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے افرنگ کی متجسس نگاہوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ دنیا کو کس نظام کی تلاش ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی انہیں اس نظام کی جھلک دکھائی نہیں دے گی۔ اس نظام کو کسی نئے خطۂ زمین میں قائم کر کے، دنیا کو دعوت دینی چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کا مشاہدہ کر لیں۔ اس کے لئے انہوں نے کہا تھا کہ

کر سکے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد میری نگاہ نہیں سوئے بصرہ و بغداد

اس قسم کی تازہ بستی آباد کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ ان کا مقصد اس میں قرآنی نظام کا قیام تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ اس دعوت کی سخت مخالفت ہوگی اس لئے اسے قائم کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی۔ اسے وہی قائم کر سکے گا جو عمرؓ کی روح لے کر آگے بڑھے گا۔

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند خلیفہ ہے، وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ــــ حسبنا کتاب اللہ ــــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

پاکستان میں نظامِ حکومت کے متعلق یہی تصور قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے اصول ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول، ، احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (حیدر آباد دکن کا انٹرویو)

پاکستان میں اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اس نظام نے بالآخر قائم ہو کر رہنا ہے۔ اس کا قیام جس کسی کے بھی مقدر میں ہوا اسے اس کے لئے نیا نام رکھنا ہوگا۔ وہ نہ ملوکیت ہوگی نہ آمریت۔ نہ تھیا کریسی ہوگی نہ ڈیما کریسی۔ چونکہ اس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی، اس لئے وہ اپنے مفہوم اور مقصود کے اعتبار سے (QURAN-O-CRACY) ہوگی ــــ یعنی مملکتِ قرآنیہ۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ اس پر شخصی تسلط نہ ہو سکے، اسے "ملّی مملکتِ قرآنیہ" کہا جا سکے گا۔ یعنی وہ مملکت جس کا نظم و نسق ملّت کے ذمہ ہو لیکن جس پر حکمرانی بااقتدارِ اعلیٰ کتاب اللہ (قرآنِ مجید) کا ہو۔ یہی وہ نظام ہے جس کی دنیا کو تلاش ہے۔ اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا کیونکہ اگرچہ یہ درحقیقت اسلامی ہوگی لیکن ہمارے مذہبی فرقوں کے اختلافات کی وجہ سے "اسلام" کا کوئی متفق علیہ متعین مفہوم ہی نہیں رہا۔ ہر فرقہ (بلکہ اب تو ہر شخص) کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے۔ قرآن کوئی نظریہ یا تصور نہیں۔ وہ ایک محسوس اور مرئی کتاب ہے جس کے منزل من اللہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لئے اس مملکت کو اسلامی کے بجائے قرآنی کہنا ہوگا۔ خود خدا نے بھی: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴/۵) کہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اسلام وہ الدین (نظامِ حیات) ہے جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہے۔ اس سے مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔

(٭)

[illegible]